جامعہ عثمانیہ
کے اردو ڈاکٹر قلم کار

ڈاکٹر عابد معز

جامعہ عثمانیہ
کے اردو ڈاکٹر قلم کار

ڈاکٹر عابد معز

ناشر

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

کتاب	**جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار**
مصنف	ڈاکٹر عابد معز ایم بی بی ایس (عثمانیہ)، ایم ایس سی (تغذیہ)
فون	95020 44291
ای میل	abidmoiz@gmail.com
سرورق	ڈاکٹر محمد کلیم محی الدین
پیشکش	عبدالصّمد
اشاعت	اکتوبر 2024ء
صفحات	192
ناشر	ایم آر پبلی کیشنز
	10 میٹرو پول مارکیٹ، 25-2724، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی 2
	فون: 9810784549 & 9873156910

Title	: Jamia Osmania Ke Urdu Doctor QalamKaar
Language	: Urdu
Author	: Dr. ABID MOIZ
Mobile & Email	: 95020 44291 abidmoiz@gmail.com
Title	: Dr. Mohammed Kalim Mohiuddin
Presentation	: Abdus Samad
First Edition	: October 2024
Publisher	: M. R. Publications
	: 10 Metropole Market, Darya Gunj, New Delhi 2.
	: Ph: 9810784549 & 9873156910
Pages	: 192
Price	: Rs 300
ISBN	: 978-93-6058-305-7

انتساب

اُردو زبان کی بقا اور ترقی و ترویج

کی کوششیں کرنے والے میڈیکل ڈاکٹروں

کے نام

عابد معز

ترتیب

ترتیب

پیش لفظ

ہم کسی ڈاکٹر یعنی وہ شخص جو جدید طب کا پیشہ اختیار کرنے کا قانوناً مجاز ہوتا ہے یا ایم بی بی ایس کی ڈگری رکھتا ہے کو مشاعرہ پڑھتے یا ادبی تخلیق پیش کرتے ہوئے سنتے یا دیکھتے ہیں تو حیرت اور استعجاب میں گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر بھی شاعر یا ادیب ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نبض ٹٹولنا اور نسخہ تجویز کرنے کی بجائے 'عرض کیا ہے' کیوں کر رہے ہیں۔

ماضی میں ایک مرتبہ میرے ڈاکٹر اور ادیب ہونے کے حوالے سے اس قسم کی بے یقینی کی کیفیت کا شکار میرے دو شناسا ہو چکے ہیں۔ ایک شناسا کا خیال تھا کہ میں ادب کا ڈاکٹر ہوں اور میں نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹر ہوں اور ادب تخلیق کرتا ہوں جبکہ دوسرے شناسا کا دعویٰ تھا کہ میں میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ادیب بھی ہوں۔ فیصلہ کرنے کے لیے انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ 'جناب والا! آپ کیا چیز ہیں؟'

'جی میں میڈیکل ڈاکٹر اور ادیب دونوں ہوں۔' میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر پہلے شناسا نے 'عجب۔۔۔عجب۔۔۔' کہا۔ پھر بھی تشفی نہ ہونے پر مزید حیرت کا یوں اظہار کیا۔ 'ڈاکٹر ادیب یا شاعر بھی ہو سکتا ہے، حیرت ہے!'

لیکن اس حیرت اور استعجاب سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ میری طرح دیگر میڈیکل

ڈاکٹروں نے ادب کی شعری اور نثری اصناف حتیٰ کہ تحقیق وتنقید میں بھی نام کمایا ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے میں ادب اور میڈیکل ڈاکٹروں کے موضوع میں دلچسپی لینے لگا۔ خاصہ مواد ہاتھ آیا اور میں نے چند مضامین لکھے جو مختلف جرائد بشمول یک موضوعی مجلّہ 'انداز بیان 3: میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' میں شائع ہوئے۔

ایک مضمون میں نے بعنوان 'جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور ڈاکٹرس' لکھا تھا جس میں عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کا مختصراً تذکرہ کیا گیا تھا جنھوں نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں حسبِ مقدور حصّہ لیا ہے۔ مضمون پسند کیا گیا اور دوسرے رسالوں میں ڈائجسٹ بھی ہوا۔

احباب نے مشورہ دیا اور خود مجھے بھی خیال آیا کہ جامعہ عثمانیہ کے میڈیکل ڈاکٹروں کی اردو خدمات پر تفصیل سے لکھنا چاہیے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ میں جامعہ عثمانیہ کا ایم بی بی ایس ڈگری یافتہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں اور دوئم یہ کہ جامعہ عثمانیہ کی انفرادیت اردو زبان تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی برصغیر کی پہلی یونیورسٹی ہے جس میں کسی ہندوستانی زبان (اردو) کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم بشمول طب جدید اور انجینئرنگ پڑھائی جاتی تھی۔ اس بنا پر طالب علموں کو اردو زبان وادب سے لگاؤ ایک فطری عمل تھا اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے میڈیکل ڈاکٹر کسی دوسرے جامعہ کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔

ڈاکٹر (مسز) زینب حسینیؒ 'کلیہ طبّیہ' کے عنوان سے عثمانیہ میڈیکل کالج میں اپنے طالب علمی کے دور کو یاد کرتے ہوئے مضمون میں لکھتی ہیں کہ 'چونکہ دکن میں اردو کو بہت مقبولیت حاصل تھی اور یہاں کے بچے بچے کو ادب سے لگاؤ تھا، اس لیے ڈاکٹروں میں بھی اکثر ادیب اور شاعر ہوتے۔ چنانچہ کبھی کبھار یہاں محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوتی۔'

میرے طالب علمی کے دور میں عثمانیہ میڈیکل کالج کے میگزین میں اردو کا حصّہ بھی ہوتا تھا جس میں طلبا اردو میں اپنی تخلیقات (افسانے، غزلیں، نظمیں، مضامین) پیش کرتے تھے۔ کالج ڈے تقریبات میں اردو ڈرامے اور اسکٹس بھی پیش کیے جاتے تھے۔ میں نے سنہ 1977ء میں ایک

ڈرامہ 'میڈیکل مغل آعظم' لکھا اور اپنے دوستوں کی مدد سے اسٹیج کیا تھا۔ معلوم نہیں اب ایسا ماحول ہے بھی یا نہیں!

میں نے جامعہ عثمانیہ سے وابستہ پندرہ سے زیادہ میڈیکل ڈاکٹروں کے متعلق سوانحی مضامین لکھ لیے اور ڈیڑھ سال قبل انہیں کتابی شکل میں پیش کیا اور قارئین سے اس تلاش میں مدد کرنے کی درخواست کی۔ میں نے بھی تلاش جاری رکھی لیکن دوسرے ڈاکٹر قلم کاروں سے متعلق معلومات نہ ملنے کے سبب کل پیش آنے لگی ہے۔

تلاش کے دوران دوسرے ادیبوں کے جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹروں پر تحریر کردہ دو ایک مضامین بھی ہاتھ لگے۔ قابل لحاظ تعداد میں مضامین جمع ہونے پر انہیں ایک علیحدہ کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں کی ادب میں دلچسپی لینے سے متعلق میرے دوسرے مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

ماضی میں بعض ڈاکٹر ایسے بھی ہیں جنھوں نے تخیلاتی ادب (فکشن) کے بجائے اردو میں جدید طب کی کتابوں کا ترجمہ کیا یا تالیف کی ہے۔ یہ کتابیں اردو کے ذریعہ ایم بی بی ایس کی تعلیم میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ ترجمہ و تالیف کرنے والے ڈاکٹروں کے بارے میں معلومات یا مضامین کتاب کا حصّہ نہیں ہے۔ اب یہ بات قصّہ پارینہ ہو چکی ہے اور ان کتابوں تک رسائی اور ان کے مولفین کے بارے میں معلومات بھی دستیاب نہیں ہیں۔ تشنگی بہر حال محسوس کی جائے گی۔

مسودہ تیار ہونے کے بعد میں کتاب کا سابقہ عنوان 'جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان و ادب پرور ڈاکٹر' کے بجائے نیا عنوان 'جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار' رکھنے کا فیصلہ کیا۔

کتاب کا مقدمہ تحریر کرنے کی درخواست سے متعلق ناموں پر سوچنے لگا تو ذہن میں ایک ہی نام آیا اور وہ برادرم حقانی القاسمی کا ہے۔ اس موضوع پر موصوف کی نظر ہے اور انھوں نے ڈاکٹر قلم کاروں پر دستاویزی حیثیت کا کتابی رسالہ 'میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' سنہ 2020ء میں شائع کر چکے ہیں۔ میں نے جناب حقانی القاسمی سے خواہش کی اور انھوں نے مجھے ممنون فرما کر جامع مقدمہ تحریر کیا ہے۔

میری یہ کتاب بھی برادرم عبدالصمد کی نگرانی میں ایم آر پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہورہی ہے۔اس کتاب کا سرورق ڈاکٹر محمد کلیم محی الدین نے بنایا ہےاور کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی اور محترمہ شاہ تاج خان صاحبہ کے مشورے شامل رہے ہیں۔آپ حضرات کی مہربانیوں کے لیےان سبھی کا تہہ دل سےشکریہ ادا کرتا ہوں۔

کتاب کے مطالعہ سے اردو قارئین کو اندازہ ہوگا کہ اس زبان کی محبت کے اسیر میڈیکل ڈاکٹر بھی رہے ہیں اورانھوں نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود بھی اپنی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے وقت نکالتے ہیں۔اس بارے میں قارئین اپنی رائے سے مطلع فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

ڈاکٹر عابد معز

حیدرآباد۔

اکتوبر 2024ء

مقدمہ

اردو میں فرسودہ فرامین وفرمودات ہی تنقیدی بحث ومباحثہ کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔ اکثر سمیناروں کے موضوعات میں بھی کہنگی ہوتی ہے، ان میں بھی صرف مخصوص چہروں اور ناموں کی نمائش ہوتی ہے اور زیادہ تر سمیناروں میں کنو ینر پروفیسر کی ذریت کا ہی تسلط رہتا ہے۔ اسی لیے یہ تصور عام ہوتا جارہا ہے کہ اردو کی موضوعاتی زمین تنگ سے تنگ تر ہوگئی ہے۔ اردو کی تنگ دامانی کا گلہ پہلے غیروں کو تھا مگر اب اپنے بھی شکوہ بداماں ہیں کہ اردو زبان وادب میں نئی جہات اور زاویوں کے امکانات بھی معدوم ہوئے جارہے ہیں۔ تحقیق وتنقید کی سطح پر جمود کی سی کیفیت ہے مگر اس منجمد اور مضمحل ماحول میں کچھ ایسے متحرک اذہان بھی ہیں جو نئے موضوعاتی جزیرے کی تلاش میں کامیاب ہیں اور نئی موضوعاتی قندیل سے ذہن ونظر کو نئی روشنی عطا کررہے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز کا شمار ایسے شہیدان جستجو میں کیا جاسکتا ہے جو تحقیق وتنقید میں نئی رہگزر تلاش کر لیتے ہیں اور نئی برق تجلی سے حیرت زدہ بھی کرتے رہتے ہیں۔

اردو کے ڈاکٹر قلمکار بھی ایک نیا موضوعی منطقہ ہے جس کی سیاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد معز نے ایسے نجوم وجواہر اور گوہر تابدار تلاش کر لیے ہیں جن کا اردو سے پیشہ ورانہ رشتہ تو نہیں مگر اس زبان سے ذہنی اور جذباتی لگاؤ ضرور ہے۔ اس لیے اردو سے باضابطہ وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسے افراد نے اردو زبان کی فنی وفکری ثروت میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ یہ بھی احساس دلایا کہ اردو نہ

فسانہ بادہ وساغر ہے اور نہ ہی گل وبلبل کی حکایت سے عبارت ہے بلکہ یہ علمی اور سائنسی زبان بھی ہے۔تراجم کے ذریعہ ہی سہی مگر اردو نے اپنے دامن میں بیشتر عصری علوم وفنون کو سمیٹ لیا ہے۔اس ذیل میں شمس الامراء اور دارالترجمہ عثمانیہ کا ذکر ضروری ہے کہ ان کی بدولت اردو سائنسی اور سماجی علوم سے آشنا ہوتی گئی اور جدید سائنسی تکنیکی ایجادات اور تحقیقات بھی اردو زبان کا حصہ بنتے گئے۔امیر کبیر نواب محمد فخرالدین خاں شمس الامرا حیدرآبادی نے علم پرور اور ادب دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو زبان کو سائنسی سرمایے سے مالا مال کیا۔فلکیات، ریاضیات، ہیئت اور دیگر علوم کی کتابوں کے علاوہ میڈیسن سے متعلق بھی کئی اہم کتابوں کے ترجمے کرائے اور طب سے متعلق کتابیں شائع کروائیں۔ان میں نافع الامراض،خلاصۃ الادویہ،کفایۃ العلاج اور بھوگ بل قابل ذکر ہیں۔اس کی مزید تفصیل خواجہ حمیدالدین ایم اے عثمانیہ کی کتاب 'شمس الامرا کے سائنسی کارنامے' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح سلطان العلوم میر عثمان علی خان کا قائم کردہ ادارہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔اس ادارے کا امتیازی اختصاص یہ رہا ہے کہ یہاں ابتدا تا انتہا ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔جملہ سائنسی اور سماجی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔شاید اسی مقصد کے تحت دارالترجمہ (سرشتِ تالیف وترجمہ کا قیام عمل میں آیا) اور ایک مجلس وضع اصطلاحات بھی قائم کی گئی جس سے ملک کے اعیان واکابر وابستہ تھے۔یہاں سے بھی میڈیسین کی کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی شائع کیے گئے۔امراض چشم اور پراکٹیکل فارمیسی جیسی کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ ہیلی برٹن کی کتاب کا ترجمہ 'مبادیِ جنسیات' کے نام سے ڈاکٹر حیدر علی نے کیا تھا۔اس طرح کے اور بھی مترجمہ کتابیں شائع کی گئیں۔

یہ فیض ہے ان شخصیات کا بھی جن کا اردو سے پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے بلکہ وہ دوسرے شعبوں اور زبانوں کے فیض یافتہ ہیں یا انھوں نے اسناد حاصل کی ہیں۔میں نے اپنے مضمون 'اردو سے غیر پیشہ ورانہ افراد کی اردو خدمات' موشوعہ ماہنامہ 'یوجنا' نئی دہلی، فروری 2021ئمیں ایسے معتبر و مستند ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے لکھا ہے جو معاشیات، کامرس، جغرافیہ، ریاضیات، لاء،

انجینئر نگ، نباتات یا تاریخ کے سند یافتہ تھے یا انگریزی ادبیات اور نفسیات سے تعلق رکھتے تھے مگر اردو زبان وادب کو نئے زاویوں اور امکانات سے روشناس کرایا ہے اور اس زبان کو جمود و تحرک سے باہر نکالا ہے۔ ناوابستگانِ اردو کی اس فہرست میں ادبی مورخین اور تذکرہ نویسوں نے تاریخ ادب اردو، انگریزی کے مصنف رام بابو سکسینہ ایم اے انگریزی اور ضخیم تذکرہ 'خمخانہ جاوید' لکھنے والے لالہ سری رام (ایم اے انگریزی) کے نام بہت ہیں۔ اسی طرح اردو کے مستند و معتبر محققین میں مالک رام، مختارالدین احمد، کالی داس گپتا رضا، قاضی عبدالودود، نثار احمد فاروقی، پروفیسر نذیر احمد اور رشید حسن خان ہیں جو اردو کے نہیں بلکہ دوسری زبانوں یا علوم کے سند یافتہ ہیں۔ اردو نقادوں میں الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، شبلی نعمانی، کلیم الدین احمد، اسلوب احمد انصاری، فضیل جعفری، دیویندر اسر، کرامت علی کرامت وغیرہ کا بھی اردو زبان وادب سے براہِ راست نصابی یا تدریسی رشتہ نہیں ہے۔ شعری منظرنامے میں بھی زیادہ تر معتبر نام انہی کے ہیں جن کا اردو سے پیشہ ورانہ یا تدریسی تعلیمی تعلق نہیں ہے۔ ایسی شخصیات میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، میراجی، ن م راشد، مجروح سلطانپوری، ساحرلدھیانوی جیسی بڑے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن میں بھی رشید جہاں، مصطفیٰ کریم، انور سجاد، حسن منظر، آصف فرخی، خالد سہیل، بلند اقبال وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ دیگر اصنافِ ادب ڈراما، طنز و مزاح، مثنوی اور قصائد کا بھی یہی معاملہ ہے حتیٰ کہ اصطلاحات سازی اور فرہنگ نویسی بھی اردو کے آؤٹ سائڈرز کی دین ہیں۔ اس تعلق سے مولوی وحیدالدین سلیم کا ذکر ضروری ہے کہ اصطلاحات سازی کے سلسلے میں ان کی کتاب 'وضع اصطلاحات' بنیادی حیثیت اور اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح اردو میں سائنسی اور تکنیکی ادب تحریر کرنے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ان میں بیشتر وہی نام ہیں جن کا اردو ادبیات سے کوئی رشتہ نہیں ہے بلکہ یہ سب سائنس بیک گراؤنڈ کے ہیں۔ طبیعیات، نباتات اور دیگر سائنسی موضوعات کے ڈگری یافتگان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبیات اور اقبالیات میں بھی بیشتر وقیع کام انہی لوگوں کا ہے جن کا دوسرے شعبوں سے تعلق رہا ہے اور جنھوں نے اقبال شناسی کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ ان میں فزکس کے سند یافتہ وہاب قیصر کا نام نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے تفہیم غالب کو ایک نیا زاویہ دیا اور کلامِ غالب کی سائنسی تعبیر و تفہیم کے

ذریعے غالب شناسی کی ایک نئی راہ پیدا کی۔ ان کی کتاب 'سائنس اور غالب' اس تعلق سے بہت معروف ہے۔ اس کے علاوہ 'غالب کا دل' کے عنوان سے انھوں نے اپنے ایک مضمون میں 'دل' سے متعلق غالب کے اشعار نقل کرنے کے بعد سائنسی زاویے سے ان کی تفہیم و تجزیے کی کوشش کی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ غالب کے تعلق سے ادبی دنیا میں ایک فقرہ بہت مشہور ہے کہ ہندوستان میں دو مقدس کتابیں ہیں۔ ایک 'وید مقدس' اور دوسرا 'دیوانِ غالب'۔ یہ فقرہ لکھنے والے 'محاسنِ کلام غالب' کے مصنف عبدالرحمٰن بجنوری ایل ایل بی اور باریٹ لا تھے۔ انھوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ خلیفہ عبدالحکیم نے بھی اقبال کو ایک نئے زاویے سے سمجھا اور پرکھا۔ وہ بھی اردو کے نہیں انگریزی کے اسکالر تھے۔

جہاں تک میڈیکل سائنس سے وابستہ افراد کی بات ہے تو انھوں نے اردو زبان کو وسیع تر جولان گاہ عطا کی ہے اور نئی لفظیات و اصطلاحات دی ہیں اور علاج تنگی داماں بھی کیا ہے۔ ان ڈاکٹروں نے صرف جسمانی امراض کی تشخیص نہیں کی بلکہ ادبیات عالیہ کی تشکیل و تجمیل میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی امراض کے اسباب و علل پر ہی نگاہ نہیں رکھی بلکہ ادب کے گیسوئے برہم کو سنوارا بھی ہے، مگر اردو زبان و ادب کے باب میں اہم کردار ادا کرنے کے باوجود انھیں اردو کا آوٹ سائڈر قرار دیا گیا اور عمداً اغماض برتا گیا۔ اردو سے پیشہ ورانہ رشتہ رکھنے والوں نے اس ذہنی اور جذباتی محبت کی قدر نہیں کی اور ارباب اردو کے جذبہ تکاثر و تفاضل کی وجہ سے اردو کا ایک زریں باب نگاہوں سے اوجھل رہا اور ان یاران اردو نے اس زبان اردو کو میر و غالب اور آتش و اقبال میں ہی الجھائے رکھا، اس سے آگے سوچنے کی جسارت نہیں کی۔ ڈاکٹر عابد معز نے بہت اچھا کیا کہ انھوں نے اس تنگ موضوعی حصار کو توڑا اور اردو کو ایک نیا موضوعاتی کینوس عطا کیا اور یہ بتایا کہ اردو میں بھی میڈیکل لٹریچر ہے۔ طبی ادب سے اردو والوں کے کان تو آشنا تھے مگر اردو میں جدید میڈیکل سائنس سے واقفیت ذرا کم تھی اور یہ بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں میڈیکل سائنس کی تعلیم اردو زبان میں بھی دی جاتی رہی ہے اور سینکڑوں افراد نے اردو میڈیم سے ایم بی بی ایس کا کورس کیا ہے اور اس کا وسیلہ بنا جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا عثمانیہ میڈیکل کالج جہاں سے ہزاروں طلبا نے اردہ میں ایم

بی بی ایس کی ڈگری لی اور کامیاب معالج بنے ،مگر صرف طبی تحقیقات واانکشافات سے سروکار نہیں رکھا بلکہ مختلف النوع تخلیقات کے ذریعہ زبان وادب کی ثروت میں بھی اضافہ کیا۔عالمی ادبیات میں بہت سے ایسے فزیشین رائٹر ہیں جنھوں نے ادبیات کو نئے زاویوں اور امکانات کی نئی دنیا سے روشناس کرایا اور بنی نوع انسان کو صحت بخش ذہنی وفکری غذا بھی مہیا کی۔اسمال پاکس ٹیکے کے موجد ایڈورڈ جینر بہت عمدہ نظمیں لکھتے تھے،ملیریا کا جرثومہ دریافت کرنے والے سر رونالڈ راس ناول نگار تھے۔ انسانی قلب کی پیوند کاری کے لیے مشہور کرسچن برناڈ کالم نگار تھے،انھوں نے آپ بیتی بھی لکھی۔ امراض قلب کے ماہر گیان چتر ویدی ہندی کے طنز ومزاح نگار تھے۔کینسر کے ماہر (oncologist) سدھارتھ مکھر جی بہترین ناول نگار تھے۔ڈاکٹر عابد معز نے وہ جنھیں ڈاکٹر قلم کار کہا جاتا ہے عنوان کے تحت اسی نوع کی بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔انھوں نے اسی کے ذیل میں ماہر اعصابیات و نفسیات سگمنڈ فرائڈ اور انٹون چیخوف کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے کہا تھا کہ طب میری منکوحہ ہے اور ادب میری محبوبہ ان لوگوں نے واقعی محبوبہ کے ناز نخرے اٹھانے اور انھیں سجانے وسنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور منکوحہ سے بھی وفاداری برقرار رکھی۔

ڈاکٹر عابد معز کا موضوعی ارتکاز جامعہ عثمانیہ کے اردو قلمکار ڈاکٹر پر ہے،اس لیے اردو زبان کے ذریعہ ڈاکٹری تعلیم پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اور حیدرآباد میڈیکل اسکول کا ذکر کیا ہے کہ اردو میں میڈیکل کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوا اور یہ سلسلہ جامعہ عثمانیہ میڈیکل کالج تک پہنچا جہاں مدتوں اردو میڈیم کے ذریعہ میڈیکل کی تعلیم وتدریس جاری رہی۔شاید اردو میں میڈیکل تعلیم وتدریس کا ہی فیض ہے کہ اردو میں میڈیکل ڈکشنریاں وجود میں آئیں جن میں میڈیکل کی انگریزی اصطلاحات کو اردو پیراہن عطا کیا گیا،ان میں مخزن الجواہر،انگریزی اردو ڈاکٹری لغات (ڈاکٹر غلام جیلانی خان)،لغات طب (حکیم غلام نبی ، ایم اے)، وصی میڈیکل ڈکشنری (مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی فاضل دیوبند) قابل ذکر ہیں۔بعد میں حالات اور دیگر تقاضوں کے مدنظر 1950ء میں انگریزی میڈیم کر دیا گیا۔انھوں نے کتاب کے تیسرے باب کو جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلمکار سے مختص کیا ہے اور اس ذیل میں جتنے عثمانین ڈاکٹر کی جستجو ممکن ہو پائی ان سب کے سوانحی کوائف اور

تحقیقی اورتخلیقی آثار سے روشناس کرانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی ڈاکٹری/طبی پہچان پرادبی شناخت حاوی ہوگئی ہے،ان میں راج بہادر گوڑ،تقی عابدی، عابد معز کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

عابد معز نے میڈیسن کے کچھ ایسے ماہرین و متخصصین کا بھی تذکرہ قلمبند کیا ہے جنھوں نے اپنی طبی تحقیقات انیقہ کے ساتھ اردو کی ادبیات عالیہ کوتوانائی اور تابندگی بخشی ہے۔ان میں فلوروسس flurosis پر تحقیق کرنے والے ابوالحسن صدیقی ،تغذیہ کے ماہرڈاکٹر عابد معز کے نام اہم ہیں۔ان ڈاکٹروں میں کچھ شعرا، کچھ مزاح نگار، کچھ کالم نگار، کچھ محقق اورتنقید نگار ہیں۔ڈاکٹر شعرامیں مشہور رباعی گور باعیات الہام،الہامِ ثانی والہام ثالث کے مصنف رگھونندن راج سکسینہ، ماہرامراض قلب اور انگریزی و اردو کے نظم نگار ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر محمد فصیح الدین خاں ،معروف غزل گو رنگاراؤ رنگین، اینستھیا لوجسٹ اور نظم کے شاعرسعید نواز بہت اہم نام ہیں۔اردواخبارات میں کالم نگاری کرنے والوں میں ڈاکٹر مجید خان،سکندر حسن،محمد قطب الدین کے نام آتے ہیں جنھوں نے صحت عامہ سے متعلق کالم لکھ کر بہت اہم معاشرتی فریضہ انجام دیا۔تحقیق وتنقید میں دو نام تو ایسے ہیں جنھیں کبھی فراموش نہی کیا جاسکتا۔راج بہادر گوڑ اور تقی عابدی۔

ڈاکٹر راج بہار گوڑ اپنی گراں تنقیدی نگارشات ُادبی مطالعے، ُادبی جائزے ُاور ُادبی تناظر ُکی وجہ سے ادبی حلقے میں مضبوط اور مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ اردوادب سے متعلق انگریزی میں مضامین تحریر کیے جو کتابی شکل میں Random Writing کے عنوان سے شائع ہوئے۔ڈاکٹر تقی عابدی علم وادب کی نہایت معتبر شخصیت ہیں۔ان کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ان میں باقیات و ناظرات فیض،فیض فہمی،فیض شناسی، چوں مرگ آید،امجد فہمی،ابواب المصائب اور کائنات نجم بہت اہم ہیں۔

تصنیف وتالیف کے باب میں بھی بہت سے اہم نام ہیں،ان میں سے ابوالحسن صدیقی (انسانی امراض وطب جدید)، ڈاکٹر مجید خان (جدید نفسیات،فکر انگیز نفسیات،شخصیت کی پہچان)، سکندر حسن (عجائبات زندگی،مہد سے لحد تک)،محمد فصیح الدین خان (ارتقائے تمدن میں اسلام کا حصہ

)،محمد یوسف احمد (مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترقی وترویج)،سید اختر احمد (خالق کائنات،اسرار کائنات)،محمد سالک (ڈاکٹر بطور مسیحا)،سید عبدالجلیل (رہنمائے صحت)،مصطفیٰ علی زیدی (خلق اعظم،خلق معظم، پیام امن)،آر طاہر قریشی (ذرا مسکرادو) وغیرہ ہیں جنھوں نے مقصدی اور مفید موضوعات پر کتابیں لکھیں اور خلق خدا کو فیض وفائدہ پہنچایا۔

ڈاکٹر عابد معز صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ان کی مطبوعہ کتابوں میں صحت وطب کے زمرے میں ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، چکنائی اور ہماری صحت،موٹاپا ہماری صحت کا دشمن،کولیسٹرال کم کیجیے، رمضان اور ہماری صحت، حج وعمرہ اور ہماری صحت،نمک کا استعمال کم کریں،ترکاری اور پھل زیادہ کھائیں، پانی ہماری زندگی اور صحت کی ضرورت،توضیحی فرہنگ: غذا اور تغذیہ، بخار مرض نہیں ایک علامت اور طنزومزاحیہ کتابوں میں عرض کیا ہے، یہ نہ تھی ہماری قسمت، فارغ البال، اردو ہے جس کا نام ہے،بات سے بات، پھر چھڑی بات، وہاں کی بات،آئی گئی بات،ہنسی طنزومزاح اور ڈاکٹر شامل ہیں۔اس کے علاوہ ’حیدرآباد میں اردو زبان کے ذریعے جدید طب‘ ان کی تازہ اہم ترین کتاب ہے،جس میں انھوں نے حیدرآباد میں جدید طبی تعلیم کے آغاز اور آصف جاہی حکمرانوں کی سرپرستی کے حوالے سے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے بقول حیدرآباد میں جدید طبی تعلیم کا آغاز بذریعہ اردو 1846ء میں ہوا اور یہاں اردو زبان سے بے پناہ لگاؤ اور دلچسپی کی وجہ سے جارج اسمتھ کی ادارت میں جدید طب کا جنرل ’طبابت‘ کی اشاعت کا آغاز ہوا۔مظفر شہ میری نے اس کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بڑی معنی خیز اور فکر انگیز بات لکھی ہے کہ ’ڈاکٹر عابد معز صاحب دراصل دو بنیادی کام کررہے ہیں، ایک تحفظ تاریخ اور دوسرا ’تحفظ فن‘۔جامعہ عثمانیہ اور اردو زبان ادب کے حوالے سے ان کی جتنی بھی نگارشات ہیں ان کے پیچھے یہی دو مقاصد کارفرما ہیں۔ یہ کتاب ’جامعہ عثمانیہ کے اردو قلمکار‘ کو بھی اسی سلسلے سے جوڑ کر دیکھا جانا چاہیے۔اس کتاب کی تصنیف کے محرکات کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

’اس کی دو وجوہات ہیں۔اول تو یہ کہ میں جامعہ عثمانیہ کا ایم بی بی ایس ڈگری یافتہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں اور دوئم یہ کہ جامعہ عثمانیہ کی انفرادیت اردو زبان تھی۔عثمانیہ یونیورسٹی برصغیر کی

پہلی یونیورسٹی ہے جس میں کسی ہندوستانی زبان (اردو) کے ذریعے اعلیٰ تعلیم بشمول طبِ جدید اور انجینئرنگ پڑھائی جاتی تھی۔'

اس نوع کی کتابیں محنت شاقہ اور عرق ریزی کے بعد ہی وجود میں آسکتی ہیں۔ عابد معز نے نہایت مشکل معرکہ بآسانی سر کرلیا اس کے لیے انھیں صمیم قلب سے مبارکباد۔ مجھے ان کی مسیحا صفت شخصیت سے امید ہے کہ میرے ان مریضانہ الفاظ کو ضرور شرف قبولیت بخشیں گے۔

حقانی القاسمی

نئی دہلی

24 اکتوبر 2024ء،

haqqanialqasmi@gmail.com

Cell.: 9891726444

وہ جنھیں 'ڈاکٹر قلم کار' کہا جاتا ہے!

طب اور ادب کے درمیان زمانۂ قدیم ہی سے گہرا اور مضبوط تعلق رہا ہے۔ قدیم زمانے اور قدیم تہذیبوں میں معالجین کی شعر و ادب سے دلچسپی کے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یونانی تہذیب کے دیومالائی قصّوں میں سورج کا دیوتا اپالو (Apollo) کا سورج (Sun)، شفا (Healing)، موسیقی (Music) اور شاعری (Poetry) کے دیوتا کے طور پر تذکرہ ملتا ہے۔

ماضی میں جب علم محدود تھا تب عالم سبھی علوم کا درک رکھتا تھا۔ اسے فلسفہ، مذہب، طب، ریاضی وغیرہ پر عبور ہوتا تھا۔ وہی عالم علاج کرتا، ادب تخلیق کرتا، فلسفہ سمجھاتا اور کائنات کی گتھیاں بھی سلجھاتا تھا۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ علم زیادہ اور بہت زیادہ ہوتا گیا تب عالم بھی کسی ایک یا دو علوم کے ماہر ہونے لگے لیکن ایسے دور میں بھی علاج معالجہ کا ربط ضبط ادب سے نہ صرف برقرار رہا بلکہ وقت کے ساتھ یہ رشتہ گہرا بھی ہوتا گیا۔

اردو زبان و ادب اور یونانی طب کے باہمی رشتے بہت مضبوط ہیں اور تقریباً ڈھائی صدیوں پر محیط ہیں۔ قدیم یونانی طب کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کیا گیا اور اردو زبان میں یونانی طب کی تعلیم دی جانے لگی جواب بھی جاری ہے۔ ملک کے طول و ارض میں اردو زبان اور یونانی طب ایک دوسرے کے بل بوتے پر نہ صرف زندہ و جاویداں ہیں بلکہ ترقی پذیر بھی ہیں۔

اردو زبان میں تعلیم پانے کے سبب یونانی طبیبوں کی اردو زبان و ادب سے دلچسپی اور

انسیت ایک قدرتی امر ہے اور مسلمہ اہمیت رکھتی ہے۔ کئی یونانی طبیب اردو کے مستند شاعر رہے ہیں۔ اردو زبان وادب کے فروغ میں یونانی طبیبوں کا اہم رول اور حصّہ بھی رہا ہے۔ اس ضمن میں کافی کام بھی ہوا ہے لیکن فی الوقت اس تحریر کا موضوع جدید طب، مغربی طب یا ایلوپیتھی اور ادب یا لٹریچر ہے۔

جدید طب، ماڈرن میڈیسن یا میڈیکل سائنس کی تعلیم دنیا کے اکثر مقامات پر انگریزی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس کی بنیادی ڈگری ایم بی بی ایس (بیچلر آف میڈیسن، بیچلر آف سرجری) یا بعض مقامات پر ایم ڈی (ڈاکٹر آف میڈیسن) ہے۔ اس بنیادی ڈگری کے بعد ڈاکٹر حضرات مزید دوسری ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور ان کے اختصاص کے لحاظ سے انھیں فزیشین یا سرجن بھی کہا جاتا ہے۔

بعض ڈاکٹر اپنے پیشہ اور فن میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ لکھتے اور ادب تخلیق بھی کرتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، ادب کا ذوق رکھنے والوں یا ادب پڑھنے والوں کی نظر سے ایسی تخلیقات گزرتی رہتی ہیں جن کو کسی ڈاکٹر نے لکھا ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط بھی نہ ہوگا کہ اکثر ڈاکٹروں کا پسندیدہ مشغلہ ادب تخلیق کرنا ہے۔

ڈاکٹر طبی موضوعات پر بھی لکھتے ہیں، یہ ان کے پیشہ کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کے ادب کو میڈیکل لٹریچر (طبی ادب) کہا جاتا ہے۔ میڈیکل لٹریچر کا شمار ادب کے نقطۂ نظر سے نان فکشن لٹریچر یا غیر افسانوی یا غیر تخیلاتی ادب میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پیشہ ورانہ ذمّہ داری کے تئیں طبی موضوعات پر لکھنے کے علاوہ شوقیہ خالص فکشن جیسے شاعری، ناول، افسانہ، کہانی اور ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

لکھنے والے یعنی ادب یا لٹریچر تخلیق کرنے والے ڈاکٹروں کو جدید طب کی دنیا میں ایک الگ نام دیا جاتا ہے۔ انھیں فزیشین رائٹر (Physician Writer) یا ڈاکٹر آتھر (Doctor Author) کہا جاتا ہے۔ اس زمرے میں ان ڈاکٹروں کو شامل کیا جاتا ہے جو علاج معالجہ یا شعبہ میڈیکل سائنس میں مصروف رہنے کے ساتھ لکھتے بھی ہیں۔ ایسے ڈاکٹر اپنے ہاتھوں میں آلہ سماعت

(Stethescope) یا نشتر لینے کے ساتھ قلم بھی اٹھا لیتے ہیں۔ فزیشین رائٹر کو ہم اردو میں ڈاکٹر مصنف، طبیب ادیب یا 'ڈاکٹر قلم کار' کہہ سکتے ہیں۔

میڈیکل سائنس یا لٹریچر (ادب) کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے کئی نام ملتے ہیں جو بیک وقت ڈاکٹر اور قلم کار بھی رہے ہیں۔ ان ڈاکٹر قلم کاروں کی ادبی تخلیقات نے عوام اور خواص کو متوجہ کیا ہے۔ امریکی ڈاکٹر ڈانیل برائنٹ (Dr. Daniel Bryant) نے ساتھی ڈاکٹر رائٹرس کی ایک فہرست ترتیب دی ہے جس میں کئی نام شامل ہیں۔ امریکہ میں لگائے گئے ایک اندازے کے مطابق میڈیکل سائنس سے وابستہ چار سے سات فی صد ڈاکٹر ادب تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔ جدید طب اور ادب کے مابین رشتہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے چند نمائندہ ڈاکٹر قلم کاروں کے نام بتانے اور ان کے ادبی کام کو ذیل میں مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

ایڈورڈ جینر (Edward Jenner) کو دنیا چیچک یعنی اسمال پاکس کے ٹیکے کے موجد کے طور پر جانتی ہے۔ یہ دنیا کا پہلا ٹیکہ تھا جسے امراض کی روک تھام کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایڈورڈ جینر کی پیدائش برطانیہ میں سنہ 1749ء میں ہوئی اور موت سنہ 1823ء میں ہوئی۔ ایڈورڈ جینر ایک ڈاکٹر اور سائنس دان ہونے کے علاوہ ایک شاعر بھی تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں چند نظمیں لکھیں جو مشہور بھی ہوئیں۔

انگریزی ادب کا ایک بہت بڑا نام جان کیٹس (John Keats) ہے جو انگریزی شاعری میں رومانوی تحریک کا بانی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ جان کیٹس کے چند مصرعے ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہیں۔ زبان زد عام وخاص فقرہ A thing of beauty is a joy for ever جان کیٹس کی نظم کا ایک مصرعہ ہے۔ جان کیٹس کی پیدائش لندن میں سنہ 1795ء میں ہوئی اور انھیں رائل کالج آف سرجنس میں داخلہ ملا تھا لیکن انھوں نے شاعری کے لیے سرجن بننے کی تعلیم وتربیت ادھوری چھوڑ دی۔ جان کیٹس کا انتقال صرف پچیس برس کی عمر میں تپ دق سے اٹلی، روم میں ہوا۔

شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) اور ڈاکٹر واٹسن (Dr. Watson)

جاسوسی ادب کے مشہور کردار ہیں جو ٹیلی وژن ڈراما سیریل کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ان کرداروں کو ایک برطانوی ڈاکٹر قلم کار سر آرتھر کونن ڈایل (Sir Arthur Conan Doyle) نے تخلیق کیے تھے جن کی پیدائش سنہ 1859ء میں ہوئی اور جنہوں نے ایڈنبرا میڈیکل اسکول سے سنہ 1881ء میں ایم بی بی ایس اور چند سالوں بعد ایم ڈی بھی کیا تھا۔ڈاکٹر ڈایل نے ابتدا طبی پریکٹس سے کی اور شوقیہ جاسوسی کہانیاں لکھیں۔انھوں نے چار اہم ناولیں اور پچاس سے زائد مختصر کہانیاں لکھی ہیں۔سر آرتھر کونن ڈایل کا انتقال سنہ 1930ء میں ہوا۔

ملیریا مچھر کے ذریعہ پھیلتا ہے اور مچھروں پر قابو پانے سے ملیریا بخار اور مرض پر قابو پایا جاسکتا ہے۔اس بات کا انکشاف سر رونالڈ راس (Sir Ronald Ross) نے سنہ 1897ء میں حیدر آباد کے مضافات میں مچھر کے پیٹ میں،ملیریا کے جراثیم دریافت کر کے کیا تھا۔ملیریا کے جرثومہ کی دریافت پر سر رونالڈ راس کو سنہ 1902ء کا میڈیسن اور فزیالوجی کا نوبل انعام دیا گیا۔یہ ایک انگریز ڈاکٹر تھے جن کی پیدائش سنہ 1857ء میں ہندوستان میں ہوئی لیکن میڈیکل سائنس کی تعلیم برطانیہ میں ہوئی اور انھوں نے سنہ 1879ء میں ایف آر سی پی کا امتحان پاس کیا تھا۔طبی میدان میں شاندار کارنامہ انجام دینے کے علاوہ سر رونالڈ راس نے شاعری کی،گانے کمپوز کیے اور ناولیں بھی لکھیں۔وہ ایک ریاضی دان بھی تھے۔ان کا انتقال سنہ 1932ء میں ہوا۔

انگریزی ادب کا ایک مشہور ناول The Vicar of Wakefield ہے جس سے انگریزی ادب کے شیدائی واقف ہیں۔ اس شہرہ آفاق ناول کو اولیور گولڈ اسمتھ (Oliver Goldsmth) نامی ڈاکٹر قلم کار نے لکھا ہے۔اولیور گولڈ اسمتھ ناول نگار، ڈراما نگار اور شاعر بھی تھے۔اولیور گولڈ اسمتھ کی پیدائش سنہ 1724ء میں ہوئی اور انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔اولیور گولڈ اسمتھ کا انتقال سنہ 1774ء میں ہوا۔المیہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی بے وقت موت خود کی غلط تشخیص کے سبب ہوئی۔

آینٹن شیخوف (Anton Chekhov) روسی ادیب اور ڈاکٹر تھے جنھوں نے ڈرامے اور مختصر کہانیاں لکھیں۔آینٹن شیخوف کی مختصر کہانیاں ادب کی تاریخ میں بہترین مختصر کہانیاں

قرار دی جاتی ہیں اور آینٹن شیخوف کو مختصر فکشن کا عظیم مصنف (Greatest writer of short fiction) کہا جاتا ہے۔ان کی پیدائش سنہ 1860 ء میں روس میں ہوئی۔آینٹن شیخوف اپنی زندگی تمام پیشہ طب اورادب سے وابستہ رہے اور طب اور ادب سے اپنے رشتہ کو واضح کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ طب میری منکوحہ تو ادب میری محبوبہ ہے(Medicine is my lawful wife and literature my mistress)۔آینٹن شیخوف کا انتقال سنہ 1904ء میں ہوا۔

کرسچین برنارڈ (Christian Barnard) جنوبی آفریقہ کے نامور ہارٹ سرجن تھے جن کی شہرت تاریخ میں کیے گئے پہلی مرتبہ انسانی قلب کی پیوندکاری (Human-to-human heart transplant) سے ہے۔ کرسچین برنارڈ نے یہ کارنامہ دسمبر 1967ء میں انجام دیا تھا۔کرسچین برنارڈ کی پیدائش سنہ 1939ء میں ایک غریب گھرانے میں ہوئی اور انھوں نے یونی ورسٹی آف کیپ ٹاؤن سے میڈیکل گریجویشن کیا تھا۔ایک بہترین سرجن ہونے کے ساتھ وہ خداداد صلاحیت کے ایک مصنف بھی تھے۔انھوں نے اپنی دو آپ بیتیاں لکھنے کے علاوہ عوام کی راہنمائی کے لیے امراض قلب اور گٹھیا (Arthritis) سے متعلق کتابیں لکھیں۔سیاست اور نسلی عصبیت جیسے موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا اور جنوبی آفریقہ کے اخباروں کے لیے کالم نگاری بھی کی۔ان کا انتقال سنہ 2001ء میں ہوا۔ان کا ایک قول پیش ہے۔

'Any man who says he doesn't like applause or recognition is either a fool or a liar.'

گیان چترویدی (Gyan Chaturvedi) سنہ 1952ء میں پیدا ہوئے اور وہ ہندی زبان کے طنز ومزاح نگار اور کالم نگار ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے انھیں پدما شری ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اتر پردیش کے رہنے والے گیان چترویدی نے ایم بی بی ایس کے بعد امراض قلب میں تربیت اور مہارت حاصل کی۔ ماہر امراض قلب کی حیثیت سے کام کیا اور اب ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔انھوں نے طنزیہ ناولیں بھی لکھی ہیں جن میں بارہ ماسی، نرگ یاترا

بہت مشہور ہوئیں۔

سدھارتھ مکھرجی سنہ 1970ء میں پیدا ہوئے اور اپنے پہلے ناول امپیرر آف آل میلوڈیز - اے بیوگرافی آف کینسر (Emperor of all Melodies: A biography of cancer) ہی سے شہرت پا گئے۔ اس کتاب کو غیر افسانوی (نان فکشن) زمرے میں سنہ 2011ء کا پولٹزر انعام (Pulitzer Prize) ملا۔ سدھارتھ مکھرجی امریکی ہندوستانی ہیں جنھوں نے ہارورڈ یونی ورسٹی سے ایم ڈی کے بعد امراض کینسر میں مہارت حاصل کی ہے۔ وہ کینسر کے ماہر یعنی آنکولوجسٹ (Oncologist) ہیں۔ سدھارتھ مکھرجی کی اس انعام یافتہ کتاب میں کینسر یعنی سرطان جیسے خشک موضوع پر بہت ہی دلچسپ اور سہل انداز میں عام لوگوں کے لیے معلومات اور ہدایات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب سے عام لوگوں کے علاوہ کینسر کے مریضوں کو بھی علاج معالجہ میں راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

نوال السعداوی مصری ڈاکٹر قلم کار ہیں جن کی پیدائش سنہ 1931ء میں ہوئی۔ انھوں نے عین الشّمس یونی ورسٹی، قاہرہ سے میڈیکل گریجویشن کیا۔ وزارت صحت کے مختلف عہدوں پر فائز رہیں۔ نوال السعداوی خواتین کے حقوق اور صحت عامہ کے متعلق بہت لکھا اور عملی جدوجہد بھی کی۔ حکومت کے خلاف ہونے پر قید بھی کی گئیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ 'جب سے میں نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا، خطرہ میری زندگی کا حصّہ رہا ہے۔ جھوٹ سے بھری دنیا میں سچ کہنے سے بڑا کوئی خطرہ نہیں ہے' متنازعہ تحریروں کے سبب انھیں اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑا۔ نوال السعداوی نے مختصر کہانیاں اور ناولیں لکھیں جن کا ترجمہ مختلف زبانوں بشمول انگریزی زبان میں ہوا ہے۔ ان کی پچاس سے زائد کتابیں ہیں۔

رابن کوک (Robin Cook) امریکی ڈاکٹر قلم کار ہیں جن کی پیدائش سنہ 1940ء میں ہوئی۔ انھوں نے نیویارک کی کولمبیا یونی ورسٹی سے میڈیکل گریجویشن اور ہارورڈ یونی ورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ حاصل کی۔ رابن کوک میڈیکل تھرلّر (Medical Thriller) لکھنے کے لیے مشہور ہیں۔ طبی حقائق کی بنیاد پر جرائم اور تجسّس سے بھری کہانی کو میڈیکل تھرلّر کہتے ہیں۔ ان کی

چند ناولیں بہت مشہور ہوئیں اوران پر فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔کوما (Coma) نامی ناول اور فلم رابن کوک کا ایک شاہکار ہے۔

تسلیمہ نسرین (Taslima Nasrin) بنگلہ دیشی ڈاکٹر، شاعرہ اور ناول نگار ہے جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔تسلیمہ نسرین کی پیدائش سنہ 1962ء میں ڈھاکہ میں ہوئی اور اس نے سنہ 1984ء میں ڈھاکہ یونی ورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا اور سنہ 1990ء تک ڈھاکہ میڈیکل کالج میں کام بھی کیا۔

تسلیمہ نسرین نے اپنی مادری زبان بنگلہ میں شاعری سے ادبی زندگی کی ابتدا کی، پھر اس نے مضامین اور ناولیں لکھیں اور کالم نگاری بھی کی۔اس کی پیدائش گوکہ مسلم گھرانے میں ہوئی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ دہریہ ہوگئی اور مذہب اسلام کو عورتیں کے خلاف بتا کر زہر اگلنے لگی ہے۔

میڈیکل لٹریچر یا طبّی ادب

ڈاکٹر قلم کاروں میں کئی ڈاکٹر ایسے بھی ہیں جنھوں نے طبی مضامین، تحقیقی مقالے، طبّی کتابیں وغیرہ لکھ کر میڈیکل لٹریچر تخلیق کیا اور اس کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔طبی موضوعات پر لکھنا ڈاکٹروں کی مجبوری ہوتی ہے اور میڈیکل سائنس کی ترقی کے لیے ضروری بھی ہے۔اس قبیل کے چند ڈاکٹر اس لحاظ سے شہرت پائی کہ ان کی تخلیقات ادب میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ان کی تحریریں ادب عالیہ کا سا لطف دیتی ہیں۔اس زمرے کے دو ڈاکٹر قلم کار سگمنڈ فرائڈ اور ولیم بوائڈ کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے۔

پروفیسر ولیم بوائڈ (Prof William Boyd) کی پیدائش سنہ 1885ء میں ہوئی اور وہ کنیڈا کی تین یونی ورسٹیوں میں پیتھالوجی (امراضیات) کے پروفیسر رہے ہیں۔انھوں نے میڈیسن اور پیتھالوجی میں چند کتابیں لکھیں جو خاصی مقبول ہوئیں۔یہ کتابیں اب بھی بڑی کارآمد ہیں اوران کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ان کی تحریر کے دو اقتباسات پیش ہیں۔

'Of all the ailments which blow out life's little candle heart disease is the chief...'

'Old diseases are passing away... but new ones are continually taking their place... The inn that shelter's for the night is not the journey's end.'

اس قسم کے جملے اور اقوال ولیم بوائڈ کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ولیم بوائڈ کا سنہ 1979ء میں انتقال ہوا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Frued) آسٹریا میں سنہ 1856ء میں پیدا ہوئے، ماہر اعصابیات اور نفسیات (Neurologist and Psychiatrist) تھے اور ان کا انتقال سنہ 1939ء میں ہوا۔ سگمنڈ فرائڈ نے ویانا سے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ ان کے نام سے ذہن میں جنسیت اور جنس پرستی جیسے موضوعات ابھرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سگمنڈ فرائڈ نے تحلیل نفسی کا طریقہ دریافت کیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ بعض نفسیاتی بیماریوں کا علاج قدیم ترین طریقہ علاج 'گفتگو' سے ممکن ہے۔ سگمنڈ فرائڈ نے مضامین اور کتابیں لکھیں اور ان کے افکار و خیالات ثقافت اور ادب کا حصّہ بن گئے ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کے اقوال کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، دو اقتباسات پیش ہیں۔

'The liberty of the individual is no gift of civilization, It was greatest before there was any civilization.'

'Neurotics complain of their illness, but they make the most of it, and when it comes to taking it away from them they will defend it like a lioness her young.'

اوپر پیش کی گئیں ڈاکٹر قلم کاروں کی چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیشہ طب اور ادب کے مابین ایک رشتہ ہے جو ڈاکٹروں کو لکھنے پر مائل کرتا ہے اور ہر زمانے میں ڈاکٹر بڑے نامور ادیب بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے دونوں میدانوں طب اور ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹروں نے میڈیکل سائنس میں اعلی ڈگریاں حاصل کیں، تحقیق کی اور انعامات بھی

حاصل کیے اور ساتھ ہی بیش بہا ادب بھی تخلیق کیا۔ ادب کے شائقین نے ان کی ادبی تخلیقات کو ہاتھوں ہاتھ لیا، نقادوں نے تبصرے اور تجزیے کیے اور مختلف ادبی انجمنوں نے انعامات سے بھی نوازا ہے۔

اکثر ڈاکٹر پیشہ طب سے وابستہ رہتے ہوئے ادب تخلیق کیا ہے تو بعض ڈاکٹروں نے اپنے پیشہ کو خیر باد کہہ کر پورے کے پورے ادب کے حوالے ہوگئے۔ جہاں ڈاکٹروں نے لکھا یا ادب تخلیق کیا ہے وہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کئی ڈاکٹر ایسے بھی ہوں گے جنھیں ادب کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ پیشہ طب بہت مصروف رکھنے والا اور دل جمعی کا طلب گار پیشہ ہے۔

ڈاکٹروں کی ادب کی جانب راغب نہ ہونے کی ایک دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پیشہ طبابت اب خدمت خلق سے زیادہ تجارت اور بزنس بن گیا ہے جبکہ ادب بالخصوص اردو ادب گھاٹے کا سودا بنتا جارہا ہے۔کون ہوگا جو منفعت بخش کاروبار چھوڑ کر نقصان اٹھانا پسند کرے گا۔

ڈاکٹر کیوں لکھتے ہیں؟

ڈاکٹر لکھنے کی جانب مائل ہوتے اور ادب تخلیق کرتے ہیں تو ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کیوں لکھتے یا لکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں؟

ماہرین ڈاکٹروں کے لکھنے کی دو اہم وجوہات بتلاتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹری پیشے میں لکھنا یا تحریری دستاویز تیار کرنا یعنی Documentation ڈاکٹروں کی ایک اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ لکھنے سے وہ بچ نہیں سکتے اور اگر نہ لکھیں تو پوچھ ہوتی ہے اور ان پر گرفت کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر مریضوں کی روداد جسے میڈیکل ہسٹری (Medical History) کہا جاتا ہے لکھتے ہیں اور جو پیشہ طب کی اہم دستاویز ہوتی ہے۔ مریض کی اس طبی روداد میں تکالیف کا بیان، تکالیف بڑھانے اور کم کرنے والے اسباب، روزمرّہ کا احوال، علاج کی تفصیل، خاندان اور کام کاج کے بارے میں اور دوسری ضروری اور غیر ضروری تفصیلات شامل ہوتی ہیں۔ بیماری کی تفصیل کے اندراج کے ساتھ ڈاکٹر کے خیال میں تکالیف کی وجوہات اور ممکنہ تشخیص پر بھی لکھنا ہوتا ہے۔

ممکنہ تشخیص کے بعد علاج معالجہ کا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی مریضوں کو ہدایات بھی دینی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ تحریر خود اور مریض کی راہنمائی اور تحفظ کے لیے ہوتی ہے لیکن اسے دوسرے بھی پڑھتے ہیں اور اکثر اوقات مریض کے ساتھ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس ماہرانہ رائے اور معائنوں کے لیے بھیجی جاتی ہے۔ جب اپنی تحریر دوسروں کے پاس جاتی ہے تو اسے بہتر سے بہتر لکھنے کی جستجو ہوتی ہے۔ غرض پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت ڈاکٹر لکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر مریضوں یعنی انسانوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ مریض اپنی کہانیاں، تکالیف اور مسائل بیان کرتے ہیں جس میں ڈاکٹر اپنا مشاہدہ شامل کر کے لکھتے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹروں کی تحریروں کا مرکز انسان اور اس سے جڑے مسائل ہوتے ہیں۔ لٹریچر یا ادب بھی تو انسان اور اس کے ارد گرد اپنا تانا بانا بنتا ہے۔

ڈاکٹروں کے پاس ہماری زندگی سے لے کر موت تک کے مختلف جذباتی مسائل پر مبنی کہانیاں ہوتی ہیں اور یہی انسانی کہانیاں ادب یا لٹریچر کی بنیاد ہوتی ہیں۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹروں کے لیے ادب تخلیق کرنا مشکل کام نہیں ہے، بس انھیں زاویہ نگاہ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی مسائل اور کہانیوں کو طبّی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے، جانچنے اور ان کا حل دریافت کرنے کی بجائے یا اس نقطۂ نگاہ کے ساتھ انسانی مسائل اور کہانیوں کو سماجی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔

اس بات کو ہم دوسرے طریقے سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگ اپنی کہانیاں لیے ڈاکٹروں کے پاس آتے ہیں اور انھیں مختلف انداز سے سناتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے پاس کہانیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے اور اچھے ڈاکٹر کو مریضوں کی کہانیاں سنانے یا بیان کرنے کا فن بھی آتا ہے۔

یوں ڈاکٹروں کو لکھنے کے لیے تیار مواد ملتا ہے اور اگر اس کے پاس وقت اور تھوڑی بہت صلاحیت ہو تو ڈاکٹر ادب (شعری و نثری) تخلیق کر سکتا ہے۔ اس بات کا ثبوت مختلف کامیاب ڈاکٹر قلم کار فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر قلم کاروں کی لکھنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انھیں راہنمائی فراہم کرنے کے

لیے ڈاکٹر قلم کاروں کی انجمنیں ہیں اور ایک حوالہ جاتی رسالہ بھی شائع ہونے لگا ہے۔ سنہ 1982ء سے 'لٹریچر اینڈ میڈیسن (Literature and Medicine)' نامی ایک جرنل شائع ہو رہا ہے جس میں ایسے تحقیقاتی اور معلوماتی مضامین شامل اشاعت کیے جاتے ہیں جو لٹریچر اور طب کے مابین رشتوں اور تعلقات سے متعلق ہوتے ہیں۔ سماجی، معاشرتی اور ادبی عوامل کا صحت اور بیماری پر اثرات کا مطالعہ بھی اس رسالہ کا مقصد ہے۔ یہ رسالہ امریکہ کے جان ہاپ کنس یونی ورسٹی پریس سے سال میں دو مرتبہ (Bianually) شائع ہوتا ہے۔

اردوزبان کے ذریعہ ڈاکٹری تعلیم

اکثر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں جدید یا مغربی طب جسے ایلوپیتھی بھی کہا جاتا ہے کا آغاز اور تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اس وقت ملک کے طول وعرض میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن جب انگریزی کی استعداد بڑھنے لگی تو ڈاکٹری کی تعلیم انگریزی زبان میں ہونے لگی جو آج بھی جاری ہے۔

ریاستِ حیدرآباد کی بات مختلف تھی۔ یہاں پر اردو تعلیمی اور سرکاری زبان تھی۔ اس لیے حیدرآباد میں اردو کے ذریعہ جدید طب کی تعلیم اور ارتقا جاری رہا۔ طب کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ اصطلاحات وضع کی گئیں۔ ایک طبّی رسالہ بھی شائع ہوا۔ جدید طب کی طریقۂ علاج کی سہولتوں کی فراہمی اور صحت عامہ کی بہتری کے اقدامات بھی اردو زبان کے ذریعہ اٹھائے گئے۔ اس دور میں سارے ریکارڈ اردو زبان ہی میں رکھے جاتے تھے۔

اردو یا کسی ہندوستانی زبان کے ذریعہ جدید طب یا طبّی علوم کی تعلیم اور فروغ کا منفرد اور مثالی کام سنہ 1846ء سے لے کر سقوطِ حیدرآباد سنہ 1948ء تک کے عرصہ میں ہوا اور اس کے لیے اٹھائے گئے اقدامات موجودہ دور میں محکمہ صحت وطبابت کی بنیاد ثابت ہوئے۔ اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب 'حیدرآباد میں اردو زبان کے ذریعہ جدید طب' میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اردو ذریعہ تعلیم سے ڈاکٹر بننے کا عمل دو وقفوں کے دوران ہوا اور کسی ہندوستانی زبان میں

تعلیم کا یہ تجربہ نہایت کامیاب بھی ثابت ہوا۔اس کے بعد برصغیر میں کہیں بھی اردو زبان میں ڈاکٹری تعلیم کا نظم نہیں ہے۔ ہر کالج اور یونیورسٹی میں میڈیکل سائنس انگریزی میں پڑھائی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں اب نئی تعلیمی پالیسی کے تحت پچھلے دو تین برسوں سے دو ایک ریاستوں میں ہندی زبان کے ذریعہ جدید طب کی تعلیم کی شروعات ہوئی ہے۔

ماضی میں اردو زبان کے ذریعہ جدید طب (ڈاکٹری) کی تعلیم دو مختلف ادوار میں ہوئی تھی اور طالب علموں کو دی جانے والی ڈگریاں بھی مختلف تھیں۔ ذیل میں ان کے بارے میں مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا دور - حیدرآباد میڈیکل اسکول (سنہ 1846ء سے 1885ء)

ریاست حیدرآباد میں جدید طب کی تعلیم کا آغاز چوتھے نظام کے حیدرآباد میڈیکل اسکول کے قیام کے حکم نامہ سے سنہ 1846ء میں ہوا۔ حیدرآباد میڈیکل اسکول میں پانچ سال تعلیم پانے والے طالب علموں کو 'حکیم' کی ڈگری عطا کی جاتی تھی۔

اردو کے ذریعہ ڈاکٹری کی تعلیم کا یہ پہلا دور ہے جو سنہ 1885ء تک تقریباً چالیس سال رہا اور جب ڈاکٹر ایڈورڈ لاری، پرنسپل بنے تو انھوں نے ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا۔ ذریعہ تعلیم کی اس تبدیلی کی وجوہات کا واضح طور پر علم نہیں ہے۔

حیدرآباد میڈیکل اسکول اپنے قیام کے بعد سے مقامی لوگوں میں جدید طب کی تعلیم دینے اور اس طریقۂ علاج کی تربیت کا فرض بخوبی انجام دیتا رہا اور اس اسکول کے فارغ طلبا دواخانوں میں کام کرنے کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ گئے، خانگی مطب کیا اور محکمہ طبابت کے مختلف عہدوں پر فائز بھی ہوئے۔ آخر سنہ 1920/21ء میں حیدرآباد میڈیکل اسکول کو ساتویں نظام کے شاہی فرمان کی رو سے کالج میں تبدیل کیا گیا اور حیدرآباد میڈیکل اسکول، عثمانیہ میڈیکل کالج کہلایا جانے لگا جس کا الحاق جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سنہ 1926ء میں ہوا۔ عثمانیہ میڈیکل کالج کا اردو زبان کی پہلی جامعہ سے الحاق کے ساتھ جدید طب کا ذریعہ تعلیم پھر سے اردو کر دیا گیا جو جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم تھا۔

دوسرا دور - عثمانیہ میڈیکل کالج، ملحق جامعہ عثمانیہ (سنہ 1926ء سے 1948ء)

دوسرا دور کلیہ طبّیہ عثمانیہ (عثمانیہ میڈیکل کالج) کا ہے جو پچیس تیس برسوں پر محیط ہے۔ ابھی ہم نے پڑھا کہ حیدرآباد میڈیکل اسکول کو کالج کا درجہ دے کر عثمانیہ میڈیکل کا نام دیا گیا اور جامعہ عثمانیہ قائم ہونے پر عثمانیہ میڈیکل کالج کو اس سے ملحق کر دیا گیا۔ طلبا کو دی جانے والی ڈگری بھی تبدیل ہوئی اور انھیں پانچ برسوں کی تعلیم اور چار امتحانوں کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری دی جانے لگی۔ امتحان لینے والے اساتذہ بھی اردو جاننے والے ہوتے تھے۔ اس موقع پر جامعہ عثمانیہ کے متعلق مختصر معلومات دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

جامعہ عثمانیہ - اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے والی پہلی یونیورسٹی

جامعہ عثمانیہ ہندوستان کی ساتویں اور جنوبی ہند کی تیسری قدیم ترین یونیورسٹی ہے اور ریاست اور شہر حیدرآباد کی پہلی یونیورسٹی ہے۔ نواب میر عثمان علی خان، نظام سابع نے ایک شاہی فرمان مورخہ 26 اپریل 1917ء کے ذریعہ اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ پہلی مرتبہ کسی یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم ایک ہندوستانی زبان اردو تھی۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کا مقصد اردو کے ذریعہ جدید علوم وفنون کی تعلیم اور تربیت دینا تھا لیکن ساتھ میں انگریزی کی ایک زبان کی حیثیت سے تعلیم ہر طالب علم پر لازمی تھی۔

جامعہ عثمانیہ کے آغاز سے ایک سال پہلے دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد اردو کے ذریعہ تعلیم کی جامعہ میں درس وتدریس کے لیے اردو زبان میں کتابیں تیار کرنا تھا۔ تقریباً ربع صدی کے دوران اس ادارہ میں علم طب اور متعلقہ شعبوں کی تیس سے چالیس کتابیں انگریزی زبان سے ترجمہ کر کے اردو میں شائع کی گئیں۔ درسی کتابوں کے علاوہ اصطلاحات سازی سے متعلق بھی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ اردو زبان کے معلوماتی ادب میں یہ گراں قدر اضافہ تھا۔

مادری زبان کے ذریعہ جدید علوم کی تعلیم دینا اس وقت ایک چونکا دینے والا اقدام تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سقوط حیدرآباد (17 ستمبر 1948ء) کے بعد

اس یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ) کا یہ انفرادی کردار باقی نہ رہ سکا اور کسی ہندوستانی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے والی پہلی جامعہ کا کردار تبدیل ہوا اور وہ عثمانیہ یونیورسٹی کہلائی جانے لگی۔

ماضی میں شائع ہوئے مختلف مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کا دور سنہ 1917ء سے سنہ 1948ء تک یعنی لگ بھگ تیس برس رہا ہے۔ میڈیکل کالج کا الحاق سنہ 1926ء میں ہوا اور عثمانیہ میڈیکل کالج میں اردو ذریعہ تعلیم سے جدید طب کا پانچ سالہ ڈگری کورس شروع کیا گیا۔ تعلیم مکمل ہونے پر ایم بی بی ایس (Bachelor of Medicine & Bachelor of Surgery، بیچلر آف میڈیسن اور بیچلر آف سرجری) کی ڈگری عطا کی جانے لگی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈگری (بشمول ایم بی بی ایس) یافتہ لوگ اپنی ڈگری کے آگے قوسین میں عثمانیہ یا Osm لکھنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھا کرتے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔ یہی نہیں، جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا اپنے آپ کو عثمانین (Osmanian) کہتے اور کہلوانا بھی پسند کرتے ہیں۔ میں اپنے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس (عثمانیہ) اور انگریزی میں M.B;B.S (Osm) تحریر کرنا پسند کرتا ہوں۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کی ایک صدی (1917 سے 2017ء) اور پانچ سال مکمل ہونے کے بعد آج بھی اس یونیورسٹی کی شناخت اور پہچان اردو زبان سے ہوتی ہے حالانکہ اب جامعہ عثمانیہ میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے اور جامعہ عثمانیہ اور اس سے ملحق کالجوں سے آہستہ آہستہ اردو زبان کی ایک مضمون کی حیثیت سے تعلیم بھی معدوم ہوتی جارہی ہے۔ یونیورسٹی کے ایمبلم میں اب صرف 'ع' کا نشان ہی اس یونیورسٹی کی اردو باقیات ہے۔

سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد میں اردو کے اس مختصر سفر کو یوں بیان کرتے ہیں کہ 'جامعہ عثمانیہ میں شمع اردو بھڑک کر گل ہوگئی'۔

مرزا ظفر الحسن اپنی کتاب 'ذکر یار چلے' میں لکھتے ہیں۔ 'اگر جامعہ عثمانیہ قائم نہ ہوتی تو کلام میر و زبان میرزا کے باوصف ہم یہ کہنے کے قابل نہ ہوتے کہ ہماری اپنی تاریخ وتہذیب کی طرح

ہماری اپنی علمی زبان بھی ہے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں قائم ہوئی مگر وہ صرف حیدرآبادیوں کی نہیں بلکہ تمام اردو والوں کی میراث تھی۔ جامعہ عثمانیہ پر سب نے اور جامعہ عثمانیہ نے سب پر فخر کیا۔ سلطنت آصفی کی سرکاری زبان اردو تھی۔ بول چال کی زبان میں قدیم دکنی کی ملاوٹ رہی اور آج بھی ہے مگر جامعہ عثمانیہ نے علمی زبان کی طرح ڈالی۔ تب ہی تو پروفیسر قاضی محمد حسین مرحوم نائب معین امیرِ جامعہ نے فرمایا تھا۔

علم نامانوس زبانوں میں قید تھا
سرزمین جامعہ عثمانیہ پر آزاد ہوا، عام ہوا'

ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس (ریٹائرڈ) لکھتے ہیں کہ 'جامعہ رہ گئی، اردو کی روایت نہ رہی۔'

اردو ذریعہ تعلیم معدوم ہونے کے بعد

ستمبر 1948ء میں سقوط حیدرآباد کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم کے تعلق سے انتشار کی کیفیت رہی اور آخر کار تعلیمی سال 1951/52ء سے اعلی تعلیم کا میڈیم اردو سے انگریزی کردیا گیا۔ عثمانیہ میڈیکل ریاستی حکومت کی نگرانی میں کام کرنے لگا اور بتدریج اردو کی نشانیاں ختم ہوتی گئیں۔ اس طرح اردو کے ذریعہ طب جدید یا ڈاکٹری کی تعلیم کا دوسرا دور بھی ختم ہوا۔

جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار

(جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور ڈاکٹرس)

پچھلے صفحات کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ میڈیکل (ایم بی بی ایس) ڈاکٹروں کی لٹریچر یا ادب سے دلچسپی کوئی غیر فطری بات نہیں ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ کئی تو نہیں، بہت سارے میڈیکل ڈاکٹروں نے لٹریچر (ادب) تخلیق کیا ہے، شاعری کی اور نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور خوب شہرت بھی بٹوری ہے۔ امریکہ میں لگائے گئے ایک اندازہ کے مطابق چار سے سات فی صد ڈاکٹر ادب تخلیق کرتے ہیں۔ ایسے میڈیکل ڈاکٹروں کو Doctor Author (ڈاکٹر آتھر) یا Physician Writer (فزیشن رائٹر) کہا جاتا ہے جنھیں ہم ڈاکٹر قلم کار کہہ سکتے ہیں۔ بعض لوگ انھیں ڈاکٹر ادیب یا ڈاکٹر شاعر بھی کہنا پسند کرتے ہیں۔

ڈاکٹروں کا ادب تخلیق کرنے میں دلچسپی لینے کی عموماً دو وجوہات گنائی جاتی ہیں۔ اول تو ان کے پیشہ میں لکھنا ضروری ہوتا ہے اور لکھنا ان کی پیشہ ورانہ ذمّہ داری ہوتی ہے۔ مریض کا حال احوال اور علاج معالجہ کو قلمبند کرنا پڑتا ہے جس سے ڈاکٹر لکھنے کو بار نہیں سمجھتے اور لکھنے کے عادی بھی ہو جاتے ہیں۔

دوئم یہ کہ مریض تکالیف اور شکایات (مرض کی روداد، History) کی شکل میں اپنی کہانی بیان کرتے ہیں۔ سو ڈاکٹروں کو لکھنے کے لیے مواد ملتا ہے۔ اس بات کو انگریزی کے نامور ڈاکٹر ناول

نگار سمرسٹ موم (Somerset Maugham) اپنا تجربہ بتلاتے ہیں کہ لکھنے والوں کے لیے علم طب اعلی درجہ کا مواد مہیّا کرتا ہے اور ڈاکٹر بیک وقت بہترین ادیب بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان وادب کے ڈاکٹر قلم کار

میڈیکل ڈاکٹروں کے قلم کار بننے کے امکانات کے پیشِ نظر جب میں نے اردو ادب میں ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کی تلاش کی تو مجھے چند اہم اور بڑے نام ملے جنھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ اپنا لوہا بھی منوایا ہے۔ ویسے تو کئی ڈاکٹروں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھیں ادب سے دلچسپی ہے۔ وہ ادب کا اعلی ذوق رکھتے ہیں اور موقع سے جو انھیں کبھی کبھار ملتا ہے ادب تخلیق بھی کیا کرتے ہیں۔

اردو رسالوں میں ڈاکٹر قلم کاروں سے متعلق مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو جناب حقانی القاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک موضوعی مجلّہ 'انداز بیان 3: میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' میں کی گئی ہے۔ پانچ سو سے زیادہ صفحات کے اس خصوصی مجلّہ میں ایک سو کے قریب ڈاکٹر قلم کاروں کے متعلق معلومات اور ان کے فن پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اردو ڈاکٹر قلم کار ہیں۔ جناب کو اس کام کے لیے دلی مبارک باد پیش ہے۔

اردو کے ڈاکٹر قلم کاروں کی یہ انفرادیت رہی ہے کہ وہ طبّی یا میڈیکل سائنس بالعموم انگریزی یا بعض مقامات پر دوسری زبانوں میں پڑھتے ہیں اور ادب اردو زبان میں تخلیق کرتے ہیں۔ اردو کے ڈاکٹر قلم کاروں کی اکثریت کی اردو مادری زبان ہوتی ہے یا وہ اپنی ابتدائی اور اسکولی تعلیم اردو کے ذریعہ پاتے ہیں۔

اردو مادری زبان ہونے یا اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کے سبب اردو سے محبت اور چاہت ایک فطری عمل ہے اور جب کسی کو کسی زبان سے الفت اور چاہت ہوتی ہے تو وہ اس زبان کو پسند کرتا اور اس کے کے فروغ میں حصّہ لیتا ہے اور اگر فنون لطیفہ سے دلچسپی ہو تو اس زبان میں ادب بھی تخلیق کرتا ہے۔

انگریزی کے ذریعہ تعلیم پانے والے چند میڈیکل ڈاکٹر اردو زبان کے شیدائی بھی دیکھے

گئے ہیں جنھوں نے شاعری کی ہے۔ امارات کے عربی نژاد اردو شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کی مثال دی جاسکتی ہے۔

اردو کے ڈاکٹر قلم کاروں کی جب بات ہوتی ہے تو ذہن جامعہ عثمانیہ طرف چلا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں جامعہ عثمانیہ منفرد اور امتیازی مقام کی حامل یونیورسٹی اس لحاظ سے ہے کہ اس جامعہ میں اردو زبان کے ذریعہ اعلی تعلیم بشمول جدید طب (ایلوپیتھی) دینے کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا۔ اس لیے جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ہی اردو زبان کا خیال آتا ہے اور جب اردو زبان کی بات ہوتی ہے تو اس زبان کو وقار اور مقام عطا کرنے کی کوششوں میں جامعہ عثمانیہ کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ گویا عثمانیہ یونیورسٹی اور اردو زبان ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔

بدقسمتی سے اردو اور جامعہ عثمانیہ کے درمیان التفات کا یہ تعلق زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا اور چند سالوں بعد ہی کسی ہندوستانی زبان (اردو) میں اعلی تعلیم کے اس تجربے کو ادھورا چھوڑ دیا گیا اور ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار

ماضی میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں کو اردو زبان وادب سے وابستگی اور دلچسپی کا جو موقع اور ماحول ملا وہ دوسرے جامعات کے ڈاکٹروں کو تو کیا خود جامعہ عثمانیہ کے موجودہ دور کے ڈاکٹروں کو نہیں ملا ہوگا۔ ہم اس بات پر بجا طور سے فخر کرنے کے ساتھ توقع کر سکتے ہیں کہ گاہے ماہے عثمانیہ میڈیکل کالج اور جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں میں شاندار ماضی کی جھلکیاں دیکھنے کو ملیں گی اور یہ بھی کہ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل جدید طب (ایلوپیتھی) کے ماہرین اس روایت کو نبھائیں گے۔

اس خیال سے میں نے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ایسے ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کو تلاش کرنے اور ان کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا جنھوں نے اردو ادب تخلیق کرنے اور اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں حصّہ لیا ہے۔ ایسے ڈاکٹروں میں وہ بھی شامل ہیں جنھوں نے عوام الناس کے فائدے کے لیے صحت اور طب کے مختلف موضوعات پر اردو زبان میں معلوماتی مضامین لکھے ہیں

یعنی وہ معلوماتی یا کارآمد ادب تخلیق کرتے ہیں۔ یہ بھی زبان وادب کی ایک خدمت ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میری 'حکیم' نامی ڈگری رکھنے والے ڈاکٹروں سے ملاقات ہوئی ہے۔ چند حکیموں کے تعلق سے کتابوں میں پڑھا ہے۔لیکن اردو زبان کے ذریعہ طب جدید کی تعلیم حاصل کر کے ایم بی بی ایس کی ڈگری رکھنے والے ڈاکٹروں سے چند برس پہلے تک ملاقاتیں ممکن تھیں اوران کے بارے میں مریضوں کی معرفت معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

میری ملاقات اردو ذریعہ تعلیم والے ڈاکٹروں سے ہوئی ہے جن میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ڈاکٹر میر محمد علی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی شامل ہیں۔

جب میں ستر کے دہے میں عثمانیہ میڈیکل کالج کا طالب علم تھا تو ہمارے استادوں میں چند ایسے پروفیسر صاحبان شامل تھے جنھوں نے اردو کے ذریعہ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔وہ بڑی نفیس اردو میں بات کرتے اور کبھی کبھار اشعار بھی سناتے تھے۔ ان کے لیکچر گو کہ انگریزی میں دیے جاتے، بڑے دلچسپ ہوا کرتے تھے۔اپنے اساتذہ میں فی الوقت مجھے پروفیسر پی پنڈیّا، پروفیسر معین الدین سندوزئی، پروفیسر وی این واگھرے یاد آرہے ہیں۔اب ایسے حضرات کا ملنا تو دور نظر آجانا بھی مشکل امر ہے۔کہیں کہیں ان کے بارے میں پڑھا اور سنا جاسکتا ہے۔

شاہ بلیغ الدین نے اپنی کتاب 'تذکرہ عثمانین' میں لگ بھگ ڈھائی سو عثمانین کے بارے میں مضامین لکھا ہے جنھوں نے اپنے کارناموں سے جامعہ عثمانیہ کا نام روشن کیا ہے۔ان میں ڈاکٹر بھی شامل ہیں جن میں سرجن منور علی، ڈاکٹر مقبول علی، ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر سید نظام الدین، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ڈاکٹر ذکی حسن، ڈاکٹر احمد محی الدین، ڈاکٹر مظفر حسین، سرجن اشفاق حسین، ڈاکٹر کرنل عبدالسبحان خان، ڈاکٹر معین الدین سندوزئی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر منیر الدین، ڈاکٹر اقبال علی خان، سرجن عبداللہ حسینی، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی پر مضامین کتاب میں شامل ہیں۔

'تذکرہ عثمانین' میں شامل جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹروں کے علاوہ بھی دوسرے کئی نام جیسے

ڈاکٹر بنکٹ چندر، ڈاکٹر قاضی عبدالباری، ڈاکٹر رام چندر بھی پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔انہیں میں ایک نام ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش کا بھی ہے۔

ذریعہ تعلیم تبدیل ہونے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے دو میڈیکل کالجوں (گاندھی میڈیکل کالج، حیدرآباد اور کاکتیہ میڈیکل کالج، ورنگل) کا الحاق ہوا۔ان میڈیکل کالجوں میں انگلش میڈیم سے پڑھنے والے اکثر طالب علموں اور ڈاکٹروں کا واسطہ اردو زبان سے تھا بلکہ اب بھی ہے اور وہ اردو زبان جانتے اور اردو ادب پسند کرتے ہیں۔

سنہ 1948ء سے جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ طب اور صحت کے مختلف کورسیز انگریزی زبان میں پڑھائے جانے لگے اور پھر گردشِ ایاّم کے دوران وہ وقت بھی آیا جب سنہ 1986ء میں طب اور صحت کے لیے ایک الگ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس ہیلتھ یونیورسٹی سے عثمانیہ اور دوسرے میڈیکل کالجس کا الحاق کر دیا گیا اور مارچ 1987ء سے اس یونیورسٹی سے شعبہ طب وصحت کی ڈگریاں بشمول ایم بی بی ایس دی جانے لگی ہیں۔اب جامعہ عثمانیہ میں اردو اور جدید طب یا میڈیکل سائنس کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کاروں کے دو گروپ بنائے جاسکتے ہیں۔گروپ اول میں ان ڈاکٹر قلم کاروں کو شامل کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اردو زبان کے ذریعہ جدید طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ان میں حیدرآباد میڈیکل اسکول کے فارغ التحصیل حکیم (ڈاکٹر) اور عثمانیہ میڈیکل کالج کے سنہ 1950ء تک کے میڈیکل گریجویٹس کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

انیس سو پچاس عیسوی کے دہے کے آغاز میں جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیے جانے کے بعد ڈاکٹروں کا ایک دوسرا گروپ بنایا جاسکتا ہے جنھوں نے ایم بی بی ایس تو انگلش میڈیم سے کیا تھا لیکن ان کی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ ہوئی ہے۔اسی گروپ میں ان ڈاکٹروں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ابتدائی تعلیم بھی انگریزی زبان میں حاصل کی تھی لیکن اردو کو ایک مضمون یا زبان اول کی حیثیت سے پڑھا ہے۔انہیں بھی اردو زبان وادب سے اُنس ہے اور انھوں نے اردو کے فروغ میں کما حقہ حصّہ بھی لیا ہے اور وہ جامعہ عثمانیہ اور اردو کی روایت کو نبھاتے

رہے ہیں۔ایسے ڈاکٹر قلم کاروں میں ڈاکٹر مجید خان، ڈاکٹر شیام سندر پرشاد، ڈاکٹر رام پرشاد، ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر مجید خان، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر سکندر حسین ، ڈاکٹر سعید نواز اور راقم کا شمار ہوتا ہے۔

ایک تیسرا گروپ بھی بنایا جاسکتا ہے جو اردو زبان کے ذریعہ تعلیم کی غرض سے قائم کی گئی جامعہ عثمانیہ کا علاقہ ہوا کرتا تھا اور جس علاقہ میں اردو سرکاری اور تعلیمی زبان ہوا کرتی تھی، میرا اشارہ سابقہ ریاستِ حیدرآباد کی طرف ہے۔ان علاقوں کے اردو ڈاکٹر قلم کاروں کے بارے میں بھی لکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان

میرے ذہن میں جن شخصیات نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، ان کے اوصاف حمیدہ اور علاج معالجے کے قصّے سنتا آرہا ہوں اور جب سنہ 1974ء میں میرا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا تو میرے بڑے بزرگ ڈاکٹر منان جیسا طبیب حاذق بننے کی تلقین کرتے اور یہی دعا بھی دیتے تھے۔

ایم بی بی ایس کی تعلیم کے دوران شاید چوتھے یا پانچویں سال میں تھا، میں ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کو دیکھنے اور انھیں سلام کرنے کی غرض سے ان کی کلینک گیا تھا۔ وہ بہت محبت اور شفقت سے ملے تو مجھے ایک قسم کی راحت ملی تھی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد میں ڈاکٹر صاحب سے گاہے ماہے دواخانے پر یا ادبی محفلوں میں ملنے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ اسری دواخانے میں کام بھی کیا تھا۔ میں اپریل 1987ء میں سعودی عرب چلا گیا۔ چھٹی پر آتا تو اردو کی محفلوں میں آپ کو دیکھتا، آپ کو سنتا اور آپ سے ملاقات کرتا تھا۔

جب میں نے ذیابیطس پر لکھے ہوئے مضامین کو کتابی شکل دے کر 'ذیابیطس کے ساتھ ساتھ' چھپوائی تو میں نے اس کتاب کی رسم اجرا ڈاکٹر سید عبدالمنان سے کروانے کا ارادہ کیا۔ میں

جناب محمد عبدالرحیم خان صاحب، سابق پرنسپال، اردو آرٹس ایوننگ کالج اور سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد، کے ہمراہ ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کے گھر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی سرسری ورق گردانی کی، خوش ہوئے اور رسم اجرا کے لیے حامی بھرلی۔ 'اردو ہال' حمایت نگر، حیدرآباد میں 20 مئی 2009ء کی شام، جلسہ 'رسم اجرا، ذیابیطس کے ساتھ ساتھ' میں ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب شریک ہوئے، میری کوششوں کو سراہتے ہوئے اپنا قلم مجھے دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ یادگار تحفہ اور میرے نام ڈاکٹر صاحب کا لکھا ہوا خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان 10 مئی 1916ء کو حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید عبدالعلی تھا اور ان کا انتقال سنہ 1921ء میں ہوا جب ڈاکٹر صاحب کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تعلیم و تربیت والدہ محترمہ کی نگرانی میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب تعلیم میں انتہائی ہوشیار اور محنتی تھے۔ سنہ 1929ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد حیوانیات اور نباتیات مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کیا اور پھر علوم طب میں ایم بی بی ایس کے لیے آپ کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے سنہ 1937ء میں جامعہ عثمانیہ سے اردو کے ذریعہ تعلیم سے ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔ آپ کے بشمول جملہ تیرہ طلبا نے اس سال ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر منان کے ساتھیوں میں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ اور پروفیسر احمد محی الدین خاصے مقبول ہوئے۔

ایم بی بی ایس کی سند حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر منان نے ایک سال کی عملی تربیت حاصل کی اور چند برس محکمہ صحت وطبابت میں حیدرآباد شہر کے نامپلی، سلطان بازار اور خیریت آباد دواخانوں میں کام کیا۔ سنہ 1940ء میں ریاست حیدرآباد کی افواج باقاعدہ میں ڈاکٹر صاحب کا لیفٹننٹ کے عہدہ پر انتخاب اور تقرر ہوا۔ فوج کی ملازمت کے دوران نظام سرکار عالی نے آپ کو سنہ 1947ء میں وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھیجا۔

برطانیہ میں قیام کے دوران اڈنبرا اور گلاسگو، دونوں جگہوں سے ایم آر سی پی

(MRCP) ڈپلومہ حاصل کیا۔ آپ نے اڈنبرا کے اسکول آف ٹراپیکل میڈیسن سے ڈی ٹی ایم ایچ (DTMH) ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب کو ایف سی جی پی (FCGP) اور ایف اے ایم ایس (FAMS) کے اعزازات بھی نوازے گئے۔ یوں آپ کے نام کے آگے کئی ڈگریاں اور اعزازات لگے رہتے تھے جن کی خواہش کئی ڈاکٹرس کرتے ہیں لیکن کسی کسی کو ہی ایسی علمی فضیلت نصیب ہوتی ہے۔

تعلیم مکمل کر کے اور ڈگریوں سے لدے پھندے سنہ 1950ء میں جب حیدرآباد واپس ہوئے تو اس وقت تک ریاست حیدرآباد کا ہندوستان میں سقوط عمل میں آچکا تھا۔ حالات بدلے ہوئے تھے۔ ترملگری کے فوجی دواخانے میں ڈاکٹر منان نوکری سے رجوع ہوئے اور بحیثیت میڈیکل آفیسر چند مہینے کام کرنے کے بعد فوج کی نوکری کو خیرباد کہا اور پرائیویٹ پریکٹس کا آغاز کیا۔ ناملی علاقہ میں اسٹیشن روڈ پر اٹھارہ برسوں تک مطب کرتے رہے۔ پھر سنہ 1969ء میں کنگ کوٹھی میں اپنے ذاتی مطب میں منتقل ہوئے جہاں پر وہ سنہ 1995ء تک پابندی سے کلینک چلاتے رہے۔ اس کے بعد انتقال سے پہلے تک گھر پر ہی صبح مریضوں کو دیکھا کیا۔ اس طرح ڈاکٹر سید عبدالمنان کچھ کم پون صدی تک مریضوں اور عوام کی بلا تکان دلجوئی اور دلجمعی سے خدمت انجام دیتے رہے جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی شادی سنہ 1938ء میں ممتاز بیگم دختر حمیدالدین فانی صاحب سے ہوئی جن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ چھوٹے لڑکے کا عین نوجوانی میں بائیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے پیشۂ طب سے وابستگی کا سوال ہے وہ ایک کامیاب معالج تھے۔ ان کے مریض انھیں مسیحا مانتے تھے۔ بحیثیت ایک ماہر طبیب یا فزیشن ڈاکٹر منان نے بلا لحاظ مذہب و ملت ہزاروں لوگوں کا علاج کیا۔ ان کے مریضوں میں امیر و غریب، خواص و عوام، مرد و خواتین، بچے اور بوڑھے سبھی شامل ہیں۔ سید امتیاز الدین لکھتے ہیں کہ حیدرآباد میں بہت کم ایسے خاندان ہوں گے جن کا کوئی نہ کوئی فرد ڈاکٹر سید عبدالمنان کے زیرِ علاج نہ رہا ہو!

انسانوں کی خدمت سے وابستہ پیشۂ طب میں ہر معالج کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مریضوں اور عوام میں مقبول ہو جائے، اس کی قابلیت اور لیاقت کا ہر سو ڈنکا بجے اور اس کی مسیحائی کے قصّے مشہور ہوں۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا اور فی زمانہ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں ہے لیکن بحیثیت طبیب یا ڈاکٹر جو عزت، شہرت، اپنائیت، محبت، احترام اور تعظیم ڈاکٹر سید عبدالمنان کے حصّہ میں آئی وہ شاید حیدرآباد شہر میں کسی دوسرے ڈاکٹر کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اس ضمن میں مجتبیٰ حسین ڈاکٹر سید عبدالمنان کے تعزیتی مضمون میں انھیں 'طبیب حاذق، طبیب الاطباء اور حکیم الاحکماء' جیسے القاب سے نواز نے کے بعد لکھا ہے کہ 'ان کے ہاتھ میں جو شفا تھی وہ سچ مچ افسانوی حد تک ایک حقیقت تھی۔ انھوں نے لاکھوں مریضوں کا علاج کیا اور ہر مریض زندگی بھر ان کی مسیحائی کا نہ صرف معتقد اور معترف بلکہ مرید بھی بن گیا۔ یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے طرز عمل اور حسنِ سلوک کے ذریعہ طبیب اور مریض کے رشتہ کو پیر اور مرید کے رشتہ کا درجہ عطا کر دیا تھا۔'

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے مریضوں کی خدمت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا اور بغیر کسی لالچ وطمع عوام الناس کی خدمت کی اور اسی سبب ڈاکٹر منان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ یہی حال ڈاکٹر منان کے ہم جماعت اور دوست ڈاکٹر سکسینہ کا بھی تھا۔ ان دونوں کے بارے میں شاہ بلیغ الدین 'تذکرہ عثمانین' (نامور فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے حالات اور کارنامے) میں لکھتے ہیں۔ 'عثمانیہ میڈیکل کالج کے دو فرزند اللہ کے بڑے مقبول بندے نکلے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی اور ہم دم بھی تھے۔ ایک کا تخلص تھا الہام دوسرے نے تخلص تو یہ نہیں رکھا لیکن اس اللہ کے بندے کو دواؤں کے تجویز کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ الہام ہوتا تھا۔ جس کا تخلص الہام تھا وہ تھے رگھونندن راج جی سکسینہ! جسے دوائیں تجویز کرنے میں الہام ہوتا تھا وہ ہیں عبدالمنان!'

مشورہ فیس لینے کے متعلق شاہ بلیغ الدین اپنے اسی مضمون 'ڈاکٹر سید عبدالمنان، طبیب لبیب' میں لکھتے ہیں۔ 'ڈاکٹر سید عبدالمنان نے اپنے ایک جونیئر ڈاکٹر بھائی کو جو اپنا مطب کھولے بیٹھا تھا نصیحت کی کہ 'میاں ۔۔۔ مریض آئے تو جو دے وہ لے لو! اللہ بڑی برکت دیتا ہے۔ یہ ان کا اپنا اصول تھا وہ کسی مریض سے خود کبھی کوئی فیس نہیں مانگتے تھے۔ طبّی امداد کے معاملے میں ان کا یہ حال تھا

کہ اگر دس مرتبہ مریض کے گھر جانا پڑے تو جایا کرتے، دن ہو رات ہو فرض اپنی جگہ فرض ہوتا ہے۔ روپے کی طمع نہ ہو تو اللہ ہاتھ میں شفا دیتا ہے۔ مریض کا اعتقاد اپنے معالج پر نہ ہو تو اسے فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔ فیسوں کے حریص ڈاکٹروں سے مریض کو عقیدت نہیں ہوتی۔'

ڈاکٹر سید عبدالمنان کے فیس لینے کے بارے میں علامہ اعجاز فرخ نے بھی لکھا ہے۔ 'منان صاحب کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی مریض فیس دیتا تو یوں گردن جھکا لیتے جیسے فیس لے کر شرمسار ہو رہے ہوں اور کثرت سے غرباء کے لیے نہ صرف دوائیں بلکہ غذا کے لیے بھی اپنی گرہ سے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کر دیتے۔'

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی مسیحائی کے قصّے ان کے مریضوں سے اکثر و بیشتر سننے کو ملتے ہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کا تعارف، خاکہ یا مضمون لکھنے والے بیشتر ادیبوں نے اس ضمن میں اپنا اور دوسروں کے تجربوں کو ثبوت کے طور پر پیش بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان حیدرآباد شہر کے ایک مشہور و معروف، ہر دل عزیز اور ہمدرد طبیب ہی نہیں تھے بلکہ وہ اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب کے عاشق بھی تھے جنھوں نے اپنی عمر تمام مریضوں اور اردو زبان کی مسیحائی میں صرف کر دی۔ کسی ایک فرد میں طبابت اور زبان و ادب کی خدمت کا ایسا امتزاج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے، آج کے دور میں تو بہت کم ڈاکٹروں کو اردو لکھنا پڑھنا آتا ہے!

ڈاکٹر سید عبدالمنان کو اردو زبان سے فطری لگاؤ اور محبت اس لیے بھی ہونی چاہیے تھی کہ انھوں نے اردو کے ذریعہ اپنی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اردو زبان کا وہ شاندار دور بھی دیکھا تھا جب اردو سرکاری، ادبی، علمی اور تعلیمی زبان تھی۔ اسی زبان نے انھیں ایسی قابلیت عطا کی تھی کہ حکومت وقت نے انہیں برطانیہ بھیجا تھا اور جب وہ وطن واپس ہوئے تو اردو نہ سرکاری زبان تھی اور نہ ہی ذریعہ تعلیم کی زبان تھی۔ اس وقت کے حالات دیکھ کر شاید انھوں نے تشخیص کر لی تھی ہوگی کہ مادری زبان سے دوری کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان کا مٹنا خود اردو والوں کے مٹ جانے کے مماثل ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کے لیے وہ اردو کی ترقی و ترویج اور بقا کے لیے مختلف اداروں سے وابستہ ہو کر کوششیں کرنے لگے۔ اپنی زندگی میں ڈاکٹر منان کئی اداروں

سے وابستہ تھے۔شہر کا کوئی اردو ادارہ یا انجمن ایسی ہوگی جس کو ڈاکٹر منان کی سر پرستی حاصل نہ رہی ہوگی!

'انجمن ترقی اردو' آندھرا پردیش کے ڈاکٹر سید عبدالمنان رکن، نائب صدر اور کچھ وقت کے لیے صدر بھی رہے۔انجمن ترقی اردو آزادی کے بعد سے اردو زبان کے تحفظ اور ترقی وترویج کے لیے ٹھوس اور بنیادی اقدامات کرتی رہی ہے۔ انجمن کی نگرانی میں چلنے والے اردو اداروں کے معاملات میں وہ خاصا وقت دیتے اور دلچسپی لیتے تھے۔'اردو مجلس' انجمن ترقی اردو کا ایک ذیلی ادارہ ہے جو اردو ادب کی ترویج کے لیے سنہ 1950ء میں قائم کیا گیا تھا۔ڈاکٹر منان اس ادارہ کی تشکیل کے وقت سے جڑے ہوئے رہے۔ان اداروں میں آپ نے پروفیسر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر راج بہار گوڑ، نواب میر احمد علی خان، منوہر راج سکسینہ، عابد علی خان، غلام یزدانی اور دیگر عمائدین شہر کے ساتھ اور شانہ بہ شانہ کام کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو کے علاوہ ڈاکٹر سید عبدالمنان 'ادبی ٹرسٹ' کے رکن اور ایک مدت کے لیے صدر بھی رہے۔ڈاکٹر منان شہر کی ایک دوسری انجمن 'میرا شہر میرے لوگ' کے سر پرست بھی تھے۔ اس انجمن یا ادارہ کا مقصد شہر کی ہمہ لسانی تہذیب اور ہندی، تلگو اور اردو ادب کو فروغ دینا ہے۔

اردو اداروں سے وابستگی کے دوران ڈاکٹر منان نے بے شمار موقعوں پر اردو کی صورت حال اور اردو کی ترقی وترویج کے موضوع پر تقریریں کی تھیں۔ان تقاریر سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اردو کے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ حضرات مجھے سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو مادری زبان والے خواہ امیر ہوں یا متوسط خاندان کے ہوں یا غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ایک قسم کا عناد ہو گیا ہے۔

☆ اردو زبان آج جس صورت حال سے دوچار ہے اس کی ذمّہ داری خود اردو والوں پر عائد ہوتی ہے۔حکومتیں کسی زبان کی ترقی کی راہیں تو ہموار کرسکتی ہیں لیکن اس کی بقا کا دارو مدار خود اس کے بولنے والوں کے عزم وحوصلے پر ہوتا ہے۔اگر وہ عزم وحوصلے سے کام نہیں لیتے، ایثار وقربانی کو شعار

نہیں بناتے۔ لسانی انا کے شعلے سے اپنے اور نئی نسل کے سینوں کو نہیں گرماتے تو دنیا کی کوئی طاقت ہماری زبان کو نہیں بچا سکتی۔ اس خطرے سے نجات کی ایک اور صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہر اردو والا آج یہ عہد کرے کہ اس کی اولاد اردو اور اردو کے علمی و ادبی اور تہذیبی ورثے سے محروم نہیں رہے گی۔

☆ حکومت اردو کے تعلق سے بلند بانگ دعوے کرتی ہے مگر عمل کی کسوٹی پر یہ دعوے اکثر غیر حقیقی ثابت ہوتے ہیں۔

☆ ایسے طلبا جو انگریزی میڈیم کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے سرپرستوں کے فرائض میں یہ داخل ہو جاتا ہے کہ گھر میں اپنے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا انتظام کریں۔ اردو ایک زبان کی حیثیت سے مستقبل میں زندہ نہیں رہ سکتی، تاوقتیکہ وہ دوسری زبانوں کے ساتھ اردو لکھنے پڑھنے کی استعداد خود میں پیدا نہ کریں۔

☆ دراصل اردو کا المیہ یہ ہے کہ اس کی اپنی کوئی ریاست نہیں ہے۔ خود اس علاقہ میں جہاں اردو کا جنم ہوا کوئی ضلع بلکہ تعلقہ بھی شاید ایسا نہیں ہے جہاں اردو والے اکثریت میں ہوں۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس کی زبانوں کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مسائل پیچیدہ اور ان کے حل دقت طلب ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے نہ صرف اعلی تعلیم حاصل کی تھی بلکہ علم طب کی اعلی وارفع ڈگریاں بھی لے رکھی تھیں۔ وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے اور اپنی قوم میں تعلیم کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ڈاکٹر منان شہر حیدرآباد کے مختلف تعلیمی اداروں سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ ان کی ترقی اور فروغ کے لیے بلا تکان کام بھی کیا۔

جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم سنہ 1948ء میں اردو سے انگریزی کر دیا گیا تو اردو زبان کے ذریعہ اعلی تعلیم کے مواقع معدوم ہو گئے۔ اس کمی کو کچھ حد تک پورا کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش نے سنہ 1962ء میں اردو آرٹس (ایوننگ) کالج قائم کیا جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اس کالج کی گورننگ باڈی کے صدر ڈاکٹر سید عبدالمنان تھے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے اس کالج کے استحکام

اور ترقی کے لیے ڈاکٹر منان کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔

شہر حیدرآباد کے اقلیتی تعلیمی اداروں سے ڈاکٹر سید عبدالمنان جڑے رہے۔ ان اقلیتی تعلیمی اداروں کے تحت کئی تعلیمی ادارے چلتے ہیں جن میں ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انوارالعلوم ایجوکیشنل سوسائٹی کے سنہ 1958ء سے وہ رکن رہے اور تقریباً سترہ برسوں تک معتمد بھی رہے۔ مدرسہ آصفیہ اور ممتاز کالج سے بھی ڈاکٹر منان مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے۔ سلطان العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی کے بھی ڈاکٹر منان رکن تاسیس تھے۔ شہر میں فنی تعلیم دینے والا اپنے وقت کا ایک مشہور ادارہ علاءالدین انسٹی ٹیوٹ کی مجلسِ انتظامی کے ایک عرصہ تک ڈاکٹر منان رکن رہے۔ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے بھی رکن تھے۔ مزید چند ادارے یقینی طور پر ہوں گے جن میں ڈاکٹر منان نے اپنی موجودگی سے فائدہ پہنچایا ہوگا۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان جہاں مختلف اردو اور اقلیتی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے وہیں وہ اپنے پرفیشنل اداروں میں بھی فعال رہے اور ان سے ربط ضبط برقرار رکھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی میڈیکل فیکلٹی کے ڈاکٹر منان دو سال تک ڈین رہے اور عثمانیہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے لیے بھی آپ کا دو مرتبہ انتخاب ہوا تھا۔ وہ میڈیکل کونسل آف انڈیا (MCI) کے 1969ء سے 1978ء تک رکن رہے۔ انجمن طلبائے قدیم عثمانیہ میڈیکل کالج کے چھ برسوں تک ڈاکٹر منان صدر رہے۔ عثمانیہ میڈیکل کالج کے احاطہ میں تعمیر کی گئی انجمن طلبائے قدیم کی عمارت کا آپ کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا تھا۔ انڈین میڈیکل کونسل کے بھی ڈاکٹر منان ممبر تھے اور کچھ عرصہ کے لیے طبّی تعلیم کی نگرانی کرنے والی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کے مریضوں میں عوام ہی نہیں امرا اور شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ نظام سابع نواب میر عثمان علی خان اور ان کے فرزند نواب اعظم جاہ بہادر کے وہ شخصی طبیب تھے۔ نواب میر عثمان علی خان کے انتقال کے بعد سنہ 1967ء میں ڈاکٹر منان نواب مکرم علی خان کے شخصی معالج مقرر ہوئے۔ شاہی افراد خاندان اور امرا کے معالج اور ان سے تعلقات اور تعاون سے ڈاکٹر منان نے فلاحی کام بھی انجام دیے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی نگرانی میں پرانے شہر کے غریب عوام کے لیے شاہ علی بنڈہ میں اسریٰ ڈسپنسری قائم ہوئی جس کے اخراجات پرنس اسریٰ اپنے جیبِ خاص سے پورا کرتی تھیں۔ سنہ 1973ء میں نظام چیریٹبل ٹرسٹ کی مدد سے اسریٰ ڈسپنسری کو دواخانے میں تبدیل کیا گیا۔ دواخانے کی نئی عمارت تیار ہوئی اور دواخانے کا نام پرنس اسریٰ ہاسپٹل رکھا گیا۔ ڈاکٹر منان اس دواخانے کے اعزازی مہتمم اور اعزازی فزیشن بھی تھے۔ دواخانے میں غریب مریضوں کا مفت یا بہت معمولی فیس پر علاج کیا جاتا تھا۔ دکن میڈیکل کالج کے قیام کے بعد طلبا کے لیے عملی تعلیم کے لیے اس دواخانے کے انتظامیہ سے درخواست کی گئی اور ڈاکٹر منان کی کوششوں سے اس دواخانے کو دارالسلام ٹرسٹ کے حوالے کیا گیا۔ اسریٰ دواخانے کے نگران کی حیثیت سے ڈاکٹر منان نے سنہ 1972ء سے سنہ 1992ء تک کام کیا اور پھر علیحدگی اختیار کرلی۔

مکرم جاہ ٹرسٹ فار ایجوکیشن اینڈ لرننگ کا قیام اور ابتدائی کارکردگی میں ڈاکٹر سید عبدالمنان کا دخل رہا ہے۔ اس ٹرسٹ کے تحت تعلیمی ادارے چلائے جاتے ہیں اور تعلیمی اداروں کے لیے مدد بھی فراہم کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان دینی اور مذہبی اداروں سے بھی منسلک رہے۔ آپ نے قرآن اور سیرت سوسائٹی کی بنا ڈالی اور 'قرانک ٹرسٹ' کے وہ برسوں تک صدر رہے۔ اس ٹرسٹ کے تحت قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ 'القران' شائع کیا گیا۔ 'طور بیت المال' ایک فلاحی ادارہ ہے جس کے تحت مسلمانوں کو بلاسودی قرض فراہم کیا جاتا ہے اور کمزور طبقوں کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ اس ادارہ سے بھی ڈاکٹر منان کی وابستگی رہی ہے اور ایک طویل عرصہ تک وہ اس ادارہ کے صدر رہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ سے بھی ڈاکٹر منان کچھ عرصہ کے لیے منسلک رہے تھے۔

اردو شعر و ادب ڈاکٹر سید عبدالمنان کی دلچسپی اور کمزوری رہی ہے۔ ڈاکٹر منان اپنے پیشے، مریضوں اور سماجی، علمی، فلاحی اور تعلیمی کاموں میں اتنے مصروف رہنے کے باوجود بھی وہ شعر و ادب کے لیے وقت نکال لیتے تھے جو حیرت کی بات ہے لیکن شوق ہو تو سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں وہ صدر یا مہمان اعزازی یا خصوصی کے طور پر مدعو کیے جاتے تھے اور انہیں آخر تک

بیٹھنا، سننا اور تقریر بھی کرنی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی صدارت میں شہر میں کئی مشاعرے منعقد ہوئے تھے اور خود ڈاکٹر صاحب شہر میں مشاعروں کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ بھی لیا کرتے تھے۔ کہیں سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ ڈاکٹر منان نے شاعری کی ہے یا کبھی 'عرض کیا ہے' لیکن شعر، شاعر و شاعری کی سرپرستی، ادب دوستی اور شعر فہمی مثالی تھی۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کے ہاتھوں کتابوں کی رسم اجرا بھی انجام پاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبی تھی کہ وہ مختصر وقت میں کتاب پڑھ کر محفل میں اس پر اظہارِ خیال بھی فرماتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان جہاں ادبی انجمنوں، مشاعروں اور محفلوں کی سرپرستی، صدارت اور انعقاد میں حصّہ لیتے تھے وہیں ادیبوں اور شاعروں کا خیال بھی رکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر منان اپنے مطب میں ادبی شخصیتوں کو اہمیت اور فوقیت دے کر معائنہ اور علاج کرتے تھے۔ ڈاکٹر منان اردو ادیبوں اور شاعروں سے معائنہ فیس نہیں لیتے تھے اور اپنے پاس سے دوائیں بھی دیتے تھے۔ بقول مجتبیٰ حسین اردو کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شاعر اور ادیب بچا ہوگا جس کی نبض تک ڈاکٹر منان کا دست شفانہ پہنچا ہو۔

اردو کی محافل میں ڈاکٹر سید عبدالمنان تقاریر کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقاریر بڑی دلچسپی اور دل جمعی سے سنی جاتی تھیں۔ تقاریر کرنے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اردو میں مضامین، انشائیے اور دوستوں کے خاکے لکھے ہیں۔ مضامین اور انشائیوں کے عنوانات جو یاد آرہے ہیں ان میں ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے، خوش حالی کی مصیبت، ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے مریضوں کے، بڑی بھول کی ہم نے ڈاکٹر بن کر شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے دو دوستوں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ اور پروفیسر احمد محی الدین پر لکھے ہوئے خاکے خاصے مشہور ہوئے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو فرصت میسّر آتی اور وہ اس جانب توجہ کرتے اور دلچسپی لیتے تو ڈاکٹر منان ایک بہترین انشاء پرداز اور خاکہ نگار ہوتے!

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی زندگی کے متعلق جب ہم مضامین پڑھتے یا اپنے بڑوں سے سنتے

ہیں تو ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ واقع ہوئے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی کے واقعات بھی مشہور ہیں۔ وہ زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے منعقد کردہ طنز و مزاح کی محفلوں میں حصّہ لیتے تھے۔ ایک ادبی اجلاس میں ڈاکٹر منان نے اپنا مضمون 'ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے مریضوں کے' سنایا اور خوب داد بٹوری تھی۔ اسی محفل میں مجتبیٰ حسین نے جواباً اپنا مزاحیہ مضمون 'ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے' سنایا تو دونوں مضامین کو سننے والے کہتے ہیں کہ محفل کے در و دیوار قہقہوں کی گونج سے لرز اٹھے تھے۔

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر منان نہایت شستہ اور دلکش زبان لکھتے ہیں اور ان کا خط بھی بہت اچھا تھا۔ ملک کے ایک ممتاز اور نامور ادیب، مزاح نگار اور کالم نگار کا یہ اعتراف اہمیت رکھتا ہے۔

عائشہ فاطمہ، ایم اے (اردو) نے حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی (ایچ سی یو) سے پروفیسر رحمت یوسف زئی، صدر شعبہ اردو کی نگرانی میں ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ 'ڈاکٹر سید عبدالمنان کی علمی و ادبی خدمات' تحریر کیا ہے۔ اس مقالہ کو کتابی شکل میں 'ڈاکٹر سید عبدالمنان جامع الصفات شخصیت' کے عنوان سے سنہ 2003ء میں شائع بھی کیا ہے۔ چوں کہ یہ کام ڈاکٹر منان کی زندگی میں مکمل ہوا ہے، اس کتاب سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق صحیح اور مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہم ہر دو، نگران کار اور مقالہ نگار کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر سید عبدالمنان کے متعلق معلومات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ عائشہ فاطمہ لکھتی ہیں۔

'ڈاکٹر منان کا نام نہ صرف ایک اعلیٰ مرتبت ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی نمایاں ہے بلکہ اردو کے اہم خدمت گزار اور محبّ اردو کی حیثیت سے بھی وہ اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ ڈاکٹر منان کو اور دو زبان و ادب سے بے پناہ دلچسپی بھی ہے۔'

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے 94 سال کی عمر میں 17 جولائی 2009ء کو وفات پائی۔ حیدرآباد شہر کی ایک نمائندہ شخصیت قصّہ پارینہ بن گئی۔ وہ اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کی نہ صرف جسمانی صحت کا خیال رکھتے تھے بلکہ سماج میں پھیلی ہوئی

بیماریاں جیسے جہالت، غربت کا علاج بھی کرتے تھے۔ طب اور مسیحائی کا ایک سنہرا باب ختم ہوا جس کی آنے والی نسلیں مثال دیں گی۔

مضمون کا اختتام میں شاہد حسین زبیری کے ڈاکٹر سید عبدالمنان پر لکھے ہوئے مضمون کے آخری پیراگراف سے کرنا چاہوں گا۔ وہ لکھتے ہیں۔ 'اس مضمون کو لکھنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حیات نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔ یہاں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جب انسان نیک نیتی، دیانت داری اور بغیر کسی لالچ کے کام خوشنودی الٰہی کے لیے کرتا ہے تو اس کے کام میں نصرت خداوندی معجزاتی طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے شامل ہو جاتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ڈاکٹر سید عبدالمنان کی حیات ہے۔'

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہامؔ

شہر حیدر آباد کی شناختی عمارت چار مینار کے دامن میں اور چار مینار سے نکلنے والے چار راستوں میں سے ایک راستہ پر چار کمان کے بہت قریب 'دکن کلینک' نامی ایک خانگی مطب تھا۔ یہ مطب ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کا تھا جسے انھوں نے سنہ 1939ء میں قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کے بعد ان کے فرزند ڈاکٹر سریش راج سکسینہ اس کلینک میں پریکٹس کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب وہ یہاں پریکٹس نہیں کرتے۔ بھلے ہی دکن کلینک بند کر دیا گیا ہے، اب بھی پرانے لوگوں کے ذہنوں میں اس دواخانے سے وابستہ یادیں بسی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ اپنے خاندانی نام سکسینہ سے مشہور تھے۔ ان کے زمانے میں اس کلینک پر بہت مرجوعہ ہوا کرتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر مریضوں کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ شہر کے بے حد مصروف چند ڈاکٹروں میں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط بھی نہ ہوگا کہ وہ چوبیسوں گھنٹے مریضوں کی خدمت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی کار میں گھر سے مطب اور مطب سے مریضوں اور خود کے گھر کی مسافت کے دوران آرام اور سو لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر سکسینہ کی طبّی خدمات کے بارے میں شاہ بلیغ الدین لکھتے ہیں۔

'اللہ نے طبیہ کالج جامعہ عثمانیہ کے اس فرزند کے ہاتھ میں بڑی شفاء دی تھی۔ وہ

اسپیشلسٹ نہیں تھا، ولایت کا ڈگری یافتہ بھی نہیں تھا لیکن ایسا ہر دلعزیز ڈاکٹر تھا کہ روپیہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہوتا گیا مگر واہ رے شرافت کہ حرص وحوس کی خو بو ذرا اسے چھو کر نہ گئی تھی، یاروں کا یار، غریبوں کا غم خوار، پریشان حالوں کا غمگسار، یہ یارِ طرح دار کبھی پیسے کی مار میں نہیں آیا۔'

چونکہ ہمارا آبائی مکان دکن کلینک سے ایک دیڑھ فرلانگ کی دوری پر تھا میں بھی چند موقعوں پر ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ کا مریض رہا ہوں۔ وہ ایک طرح سے ہمارے بھی فیملی ڈاکٹر تھے۔ سنہ 1970ء میں جب میں دسویں جماعت میں تھا اور مجھے ٹائفائڈ ہوا تھا انھیں کے زیر علاج تھا۔ وہ ہمارے گھر بھی آئے تھے۔ ان کی دھندلی سی شبیہ اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر سکسینہ کی کلینک میں معائنہ کا کمرہ یعنی جہاں وہ مریضوں کا معائنہ کرتے تھے بڑا مخصوص تھا۔ کمرے میں ایک لانبی میز تھی۔ میز کی ایک طرف مریض بیٹھتے یا چھوٹے بچے لٹا دیے جاتے اور دوسری جانب ڈاکٹر سکسینہ ایک کے بعد ایک مریض کا معائنہ کرتے اور نسخہ تجویز کیے جاتے تھے۔ اس طرح مریضوں کو دیکھنے کے متعلق ڈاکٹر سید عبدالمنان نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ 'نیند کی کمی اور متواتر کھڑے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت متاثر ہونے لگی اور ان کے پیر سوجھ گئے اور اس پر بھی آرام نہ لینے کی وجہ سے پیر پر زخم ہو گئے۔ کبھی کبھی زیادہ تکلیف ہوئی تو کام کم کر دیتے لیکن چند دن بعد پھر شروع کر دیتے۔'

بحیثیت مریض کے علاوہ بھی ڈاکٹر سکسینہ سے میری تین چار ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ آخری مرتبہ شاید 1977 یا 1978ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج کے میگزین 'آسمیکو' کے لیے 'ڈاکٹر اور شاعر' عنوان کے تحت ان کی شعری تخلیقات لینے ان کے مطب پر گیا تھا۔ ڈاکٹر سکسینہ سے ہوئی ملاقاتوں کے علاوہ بھی دیگر ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شاہ بلیغ الدین کی کتاب 'تذکرہ عثمانین' (نامور فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے حالات اور کارنامے) میں ڈاکٹر سکسینہ کے متعلق ایک مضمون شامل ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے ڈاکٹر سکسینہ کی وفات پر ایک مضمون لکھا تھا جو سب رس، کراچی کے جولائی 1991ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سکسینہ کی رباعیات کے مجموعوں سے بھی ہمیں ان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ جن کا تخلص الہاؔم تھا کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ 'رباعیات الہاؔم' سنہ 1954ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ 'الہاؔم ثانی' (رباعیات الہاؔم حصّہ دوم) سنہ 1971ء میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ 'الہاؔم ثالث موسومہ کشکول' کے عنوان سے سنہ 1982ء میں شائع ہوا ہے۔ شہنشاہ رباعیات امجد حیدر آبادی نے ڈاکٹر سکسینہ کے کلام کو دیکھا، ان پر نظر ثانی کی اور رباعیات الہاؔم کا پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور جو ڈاکٹر سکسینہ کے بچپن کے دوست ہوتے ہیں کا تحریر کردہ تعارف بھی کتاب میں شامل ہے۔ علامہ حیرت بدایونی اور استادی ابوزاہد سید یحیٰ حسینی صاحب کے مضامین بھی ہمیں ان مجموعوں میں ملتے ہیں۔ یہ کتابیں ریختہ ڈاٹ آرگ (www.rekhta.org) پر پڑھنے کے لیے موجود ہیں۔

ڈاکٹر سکسینہ کا تعلق شہر حیدر آباد کے ایک پڑھے لکھے کائستھ گھرانے سے تھا جہاں فارسی کی تعلیم گھر پر دی جاتی تھی۔ ابتدائی اسکول کی تعلیم کے دوران ڈاکٹر محی الدین قادری زور ڈاکٹر سکسینہ کے ساتھ تھے لیکن بعد میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ ڈاکٹر سکسینہ کا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ تقریباً آٹھ دس سال بعد خوش قسمتی سے ڈاکٹر سکسینہ کا منقطع کیا ہوا تعلیم کا سلسلہ پھر سے بحال ہوا۔ انھوں نے میٹرک اور ڈاکٹری میں داخلہ کے امتحانات کامیاب کیے اور ان کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا۔

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ اردو میڈیم سے تعلیم پا رہے ایم بی بی ایس کے چھٹے جتھے یا بیاج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر میر محمد علی اور پروفیسر محی الدین شامل تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان اپنے ہم جماعت کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

'رگھونندن راج سکسینہ جن کو ان کے ہم جماعت اور قریبی دوست رگھو کہتے تھے ہم سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔۔۔ رگھو بہت محنتی اور ذہین طالب علم تھے، ان کے نوٹ بکس نفاست اور خوشخطی کا نمونہ ہوتے۔ کلاس شروع ہونے اور ختم ہونے کے وقفہ میں پھکڑ بازی اور ایک دوسرے کا مذاق اڑانا اور روزمرّہ کے واقعات پر تبصرہ مرغوب مشغلہ تھا۔ اس میں رگھو کو ید طولی حاصل تھا اور کوئی بھی ان سے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کی شادی ہو گئی، اس لیے دوسرے ساتھی

رباعیات (رباعیاتِ الہاؔم سے)

دکھ درد کا اپنے کوئی درمان تو ہو
مشکل اپنی کبھی کچھ آسان تو ہو
بس چل سکے اپنا تو سفارش بھی کریں
پر ہم سے کسی کی جان پہچان تو ہو

کیا اپنے پرائے سے مصیبت کا بیاں
بہتر ہے کہ قسمت کے رکھوں عیب نہاں
کیوں کس سے کہوں میں بدنصیبی اپنی
دُکھ بانٹ لے اپنا کوئی یہ بات کہاں

بچپن میں جو دیکھا وہ جوانی میں نہ تھا
جو آج ہے کل سرائے فانی میں نہ تھا
انسان تو ہے ایک خیالی خاکہ
یک بلبلہ تھا ابھی کہ پانی میں نہ تھا

دے گا نہ مجھے تو چھین لوں گا تجھ سے
ایک ایک کے تین تین لوں گا تجھ سے
میں تو قائم رہوں گا اپنی ضد پر
مر کے بھی دو گز زمین لوں گا تجھ سے

ہر تیر ستم نشان پر آتا ہے
ہر مرحلہ اب تو جان پر آتا ہے
مرنے کی ہوس مری بناوٹ کیوں ہو
دل میں جو ہے زباں پر آتا ہے

گم کردہ رہ سے اپنی تھک جاتا ہوں
جادے سے گھڑی گھڑی بھٹک جاتا ہوں
مقصود کو سمجھتا ہوں سراب
سائے سے بھی اپنے میں بھٹک جاتا ہوں

ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔۔۔رگھو رباعی گو شاعر نہیں بنے تھے بلکہ زیادہ توجہ غزل گوئی پر تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک تازہ غزل کسی نہ کسی دوست کی شان میں لکھ لاتے، وقفہ کے دوران سناتے اور داد پاتے۔ ان کی بیشتر غزلیں اکثر کو ازبر تھیں لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں۔

جب سالانہ کالج ڈے منایا جاتا تو ڈرامے ہوتے اور مرقعے پیش کیے جاتے۔ ایک سال کالج ڈے کے دوران دیکھتے کیا ہیں کہ یکا یک رگھو تانگے والے کا سوانگ بھرے منہ میں بیڑی

رباعیات (الہاؔم ثانی سے)

لے دے کے سِوا تیرے سہارا کیا ہے
سب تیری شان ہے ہمارا کیا ہے
اچھی نبھتی ہو یا بری کٹتی ہو
ہم کو جز صبر و شکر چارہ کیا ہے

ہر گام قدم قدم بڑھاتا ہوں میں
منزل منزل قریب آتا ہوں میں
کیا خوب کیا ہے میں نے سودا الہام
خود کو کھوتا ہوں اُس کو پاتا ہوں میں

ہر کام میں اِس سے کام رانی دیکھو
کیا شئے ہے مآل خوش بیانی دیکھو
پیش آؤ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے
نفرت کی جڑ ہے بد زبانی دیکھو

اچھی ہو یا بری گزر کرنا ہے
جس طرح بھی ہوسکے بسر کرنا ہے
ہنس بول کے کیوں نہ کاٹ لیں پھر دو دن
ہر حال میں ہم کو جب سفر کرنا ہے

منزل ہی ملی نہ کوئی رستہ نکلا
گِرداب جہاں سے دلِ شکستہ نکلا
موت آنے پر گلو خلاصی جو ہوئی
روتا آیا جہاں میں ہنستا نکلا

دولت کی ہوس مدام ہم رکھتے ہیں
ہر فرض کو ناتمام ہم رکھتے ہیں
مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں
حلوے مانڈے سے کام ہم رکھتے ہیں

دبائے اپنے ٹٹو کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ان کی ہئیت اور میک اپ اور ٹانگہ کی سواری کو دیکھ کر محفل زعفران زار ہوگئی اور ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔۔۔' اس واقعہ کا ذکر شاہ بلیغ الدین نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے۔

سنہ 1937ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر سکسینہ کو سرکاری نوکری ملی اور اضلاع پر تقرر رہا۔ چند مہینے کام کرنے کے بعد نوکری چھوڑ کر حیدرآباد واپس آ گئے اور چار مینار کے دامن میں اپنا کلینک قائم کرلیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

رباعیات (الہامؔ ثالث سے)

پھوٹے گا نصیب یا پھر اچھا ہوگا
کوئی جیتے گا کوئی پسپا ہوگا
قدرت کے کھیل رازِ سربستہ ہیں
کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا

اخلاص کے ساتھ ربط بڑھ جاتا ہے
اُفتادوں میں خود ہی ضبط بڑھ جاتا ہے
اُوچھے کو اگر کہیں سے دولت مل جائے
کم فہمی سے اور خبط بڑھ جاتا ہے

اِس راہ کا رُخ کبھی نہیں کرتے وہ
کہنے پہ مرے کان نہیں دھرتے وہ
ایسوں سے ہو کیا امید ہمدردی کی
سیدھے منہ بات جب نہیں کرتے وہ

جو دور بھی اپنے مشغلے میں آیا
مشکل کے سخت مرحلے میں آیا
تقدیر کی یہ ستم ظریفی دیکھو
ٹوٹا جب ہاتھ پھر گلے میں آیا

حملہ جو ہوا دل پہ بنے صاحبِ دل
گردے بگڑے تو ہوگئے ہم بِسمل
باری پہ جگر کی بن گئے اہلِ جگر
یوں ہوگئی آسان چلو ہر مشکل

یاروں کی روش جو یاد آجاتی ہے
مایوسی عجیب قلب پر چھاتی ہے
اچھوں کو بُرے خوب ہی ٹھگ لیتے ہیں
قصّاب کو ہی تو گائے پتیاتی ہے

ڈاکٹر گھونندن راج سکسینہ جہاں ایک کامیاب، مخلص اور ہمدرد ڈاکٹر تھے وہیں وہ ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر سکسینہ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی شاعر تھے اور انھیں بھی اردو زبان سے بے انتہا انسیت تھی اور دامے، درمے اور سخنے اردو کی ترقی وترویج میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں استادی ابوزاہد سید یحیٰ حسینی لکھتے ہیں۔

'ڈاکٹر الہام کائستھ ہیں اور کائستھ برادری کے حضرات علم وادب کے شیدائی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر الہامؔ کے نانا راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ نہایت بہتر شاعر اور ادیب تھے۔ باقیؔ

کے فرزند راجہ نرسنگھ راج عالی بھی عمدہ شاعر تھے۔ الہام کے بڑے بھائی راجہ ست گرو پرشاد سکسینہ اخگر ایڈوکیٹ بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی، پی ایچ ڈی، ایف این آئی بھی نہایت اچھے شاعر اور اردو سے خاص لگاؤ ہونے کی وجہ سے ادارۂ ادبیات اردو کو اپنے خدمات جلیلہ سے مستفید کرتے رہتے ہیں۔ الہاؔم کے برادر زادہ رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ فرزند ست گرو پرشاد سکسینہ اخگر بھی اردو کے رسیا رہے ہیں۔ وہ بھی ادارۂ ادبیات اردو کی معتمدی کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر الہاؔم کے بڑے فرزند ڈاکٹر سریش راج سکسینہ ایم بی بی ایس اردو کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور وہ حیدرآباد کے جدید اردو مرکز 'اردو گھر' کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہاؔم اور ان کے خاندان کا نصب العین اردو پرستی اور ادب نواز رہا ہے'۔

ڈاکٹر سکسینہ نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا پسندیدہ صنف سخن رباعی تھی۔ وہ رباعی کہنے کے فن میں مشاق بھی تھے۔ اپنے تیسرے مجموعے میں وہ لکھتے ہیں 'اس مجموعہ رباعیات کو پیش کرتے ہوئے اسی التجا کو دہراتا ہوں کہ اس پیرانہ سالی میں میری طفلانہ کوشش کا یہ تیسرا قدم منظرِ عام ہے۔ اپنی اسی قدیم طرز میں وہی پرانا راگ الاپتا ہوں کہ زبان اردو کے خوبصورت اور برجستہ مہاورات کو رباعی کی انگشتری میں مرصع کردوں'۔

صنف سخن رباعی اور الہاؔم کی رباعیات کے متعلق حضرت حیرت بدایونی کے خیالات بھی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ تقریظ کے تحت لکھتے ہیں 'عموماً رباعی کسی ایک نظریہ پر کہی جاتی ہے مگر سکسینہ صاحب کا کمال ہے کہ ضرب المثل اور ہندی اردو کی کہاوتوں اور روزمرہ کے محاوروں کو رباعی میں اس طرح سمودیتے ہیں کہ لطف دوبالا ہوجاتا ہے اور تمام اردو کے رباعی گوشعرا میں صرف ڈاکٹر آر آر سکسینہ المتخلص الہاؔم کو یہ انفرادیت اور خصوصیت دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تینوں دیوانوں کی ہر رباعی میں اس امتیاز کو باقی رکھا ہے۔ دو لفظوں میں تعریف کردینا آسان ہے مگر عملی طور پر اس انفرادیت کو باقی رکھنا ہر رباعی گو شاعر کے بس کا روگ نہیں ہے۔

اردو کی کوئی کہاوت اور ضرب المثل ایسی نہیں ہوگی جس کو رباعی میں نظم نہ کیا ہو۔ اگر میں

یہ کہوں کہ تینوں دیوانوں میں چار، پانچ سوکہاوتیں نظم کی ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔'

ڈاکٹر سکسینہ کی رباعیات کے بارے میں امجد حیدرآبادی نے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ 'یہ میرے نئے دوست جناب آر آر سکسینہ صاحب کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو صاحب طریقت ہیں۔ وہ طریقت جس کے متعلق حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادۂ و دلق نیست

سنتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب دن رات خدمتِ خلق میں مصروف رہتے ہیں اور زندگی کا مقصود بھی یہی ہے۔

میاں امجد تمھاری جیسی مرضی — بنو کافر، کہ تم اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات — جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

میرے قدیم اور بہت قدیم دوست اور عنایت فرما ڈاکٹر زور صاحب نے مجھے ان سے اور ان کو مجھے ملایا۔ اپنی خرابیِ صحت اور کمزور بینائی کے باوجود میں نے سرسری طور پر ان رباعیات کو دیکھا جہاں تک دیکھ سکا اور سمجھ سکا بعض بعض جگہ کچھ کچھ بنا بھی دیا لیکن نہیں معلوم بگاڑا یا بنایا۔ ان رباعیات کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ زبان کے اعتبار سے بہت صاف، طرز ادا دلکش اور اردو محاورات پر متفق اور معنی خیز ہے۔'

رباعیات کے مجموعوں کی اشاعت پر ڈاکٹر سید عبدالمنان لکھتے ہیں۔ 'انھوں نے رباعیات کے تین ضخیم مجموعے شائع کیے، تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر مصروف انسان جو کہ نہانے کے لیے بھی فرصت بمشکل ملتی ہو کس وقت اور کس طرح اس قدر عمدہ اور معیاری تخلیقات کر سکا۔ یہ ان کی ذہنی حس اور زورِ قلم کا بین ثبوت ہے۔ ان کے آخری مجموعہ کی رسمِ اجرا کی ایک تقریب ان کے مکان پر ہوئی تھی جس میں میں بھی شریک تھا جو بہت سادہ اور پر اثر تقریب تھی۔'

مطب پر اور مریضوں کے درمیان بے انتہا مصروف رہنے کے باوجود ڈاکٹر سکسینہ کسی نہ کسی طرح دوسری مصروفیات کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سکسینہ طبّی پیشہ ورانہ انجمنوں، انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن (Indian Medical Association, IMA) اور

کالج آف جنرل پریکٹشنرس (College of General Practitioners) کے بانی ممبر تھے اوران کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے۔

پیشہ ورانہ انجمنوں سے وابستگی کے علاوہ ڈاکٹر سکسینہ مشاعروں اورادبی محفلوں کے لیے بھی وقت نکال کر شریک ہوا کرتے تھے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں۔’ڈاکٹر سکسینہ ادارۂ ادبیات اردو کے مشاعروں اورادبی محفلوں میں اپنے دواخانہ کی غیر معمولی بھیڑ بھاڑ کوچھوڑ کر شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور میرے والدعلیہ الرحمہ کے سالانہ یادگاری مشاعروں میں اگرچہ بڑی رات گئے بعد ہی سہی،مگرضرور شرکت کرتے ہیں لیکن اپنا کلام سنانے میں اپنی فیاضی طبع کے باوجود بخل کرتے ہیں لیکن جب کبھی سناتے ہیں تو سامعین ان کے خیالات کی بلندی، مضامین کی پاکیز گی اورطرز ادا کی خوبی کی وجہ سے مسحور ہوجاتے ہیں۔وہ زیادہ تر رباعیاں لکھتے ہیں اوران کوایک خاص لَے میں پڑھتے ہیں جواپنی بے باکی اورلوچ کی وجہ سےایک خاص اثر سوز وگداز پیدا کرتی ہے۔‘

مجھے علم نہیں ہے کہ شہر حیدرآباد میں موجود جامعات کے اردوشعبوں میں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہام کی حیات، ادبی کارناموں اوران کی رباعیات پرآیا کوئی تحقیقی کام ہواہے نہیں!اگر نہیں ہواہےتو اس جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ان کی ادبی خدمات پرایم فل اور پی ایچ ڈی کیا جانا چاہیے۔

میں اپنے مضمون کا اختتام ڈاکٹر سیدعبدالمنان کے اس آخری پیرگراف سے کرنا چاہوں گا۔وہ لکھتے ہیں۔

’میرا دوست رگھوایک پہلودار شخصیت کا حامل تھا، بہت اچھاڈاکٹر بھی تھا،شاعر بھی تھا۔ اس نے غزل بھی کہی اور رباعیات بھی کہیں لیکن سب سے زیادہ وہ ایک نیک انسان تھا جس کا نصب العین اور زندگی کا مقصد بنی نوع انسان کی خدمت بلاتفریق مذہب وملت،امیر وغریب تھا۔وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔اس نے غیر معمولی محنت کی اوراپنی صحت کا خیال نہ کیا۔اس نے روپیہ کمایا لیکن کبھی لالچ یا حرص نہیں کی۔ نہ کسی مریض کواس کا احساس ہونے دیا کہ علاج صرف روپیہ ہی سے ہوسکتا ہے۔اس نے ہرایک سے خوش کلامی اورخلوص ومروت کا برتاؤ کیا۔ان سب خصوصیات کی وجہ

سے وہ ایک Legendary Figure ہوگیا تھا۔ اگر موجودہ نسل کے لوگ ایسے نیک صفت اور برگزیدہ انسانوں کی زندگی کا بچشمِ حقیقت معائنہ کریں تو ان برگزیدہ اشخاص کی زندگیاں ایک مشعلِ راہ ہوسکتی ہیں۔'

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ نے اسّی برس کی عمر پائی اور ان کا انتقال 12 اپریل 1991ء کو ہوا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے تحریر کردہ مضامین میں روزنامہ 'سیاست' اور ہفت روزہ 'حیات' میں پڑھتا رہا ہوں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر گوڑ صاحب کی اردو زبان کی بقا، ترقی اور ترویج کے لیے کی جانے والی کوششوں سے متعلق خبریں بھی پڑھنے اور سننے کو ملتی رہی ہیں لیکن ان سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔ ڈاکٹر گوڑ سے میری تین یا چار ملاقاتیں ہی ہوئی ہیں۔ پہلی مرتبہ میں ڈاکٹر گوڑ سے ملنے محترم یوسف ناظم صاحب کے ساتھ ان کے گھر 'چنبیلی کا منڈوا' گیا تھا۔ متوسط قسم کا بہت ہی سادہ گھر تھا، محسوس ہی نہیں ہوتا تھا اس میں کوئی لیڈر رہتا ہوگا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے ملاقات ہوئی۔ ناظم صاحب نے میرا تعارف کروایا کہ یہ بھی تمھاری طرح ڈاکٹر اور ادیب ہیں۔ یہ سن کر گوڑ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے پیشہ سے وابستہ ہوں یا ڈاکٹری چھوڑ دی ہے۔

میں نے جواب دیا 'ابھی تک تو میں پیشہ کر رہا ہوں'

میرے اس جواب پر دونوں بہت لطف اندوز ہوئے۔ ڈاکٹر گوڑ صاحب نے گرہ لگائی کہ اچھا کر رہے ہو اور پھر گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے متعلق معلومات آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ان کے ہم عصر ادیبوں نے اردو میں مضامین لکھے جو مختلف رسائل اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ سے متعلق

ادیبوں کے سوانحی اور تاثراتی مضامین کو یکجا کتابی شکل بعنوان 'مجاہدِ اردو: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ' سنہ 2010ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔اس کتاب کو ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کیا ہے۔اس سے قبل سنہ 1994ء میں ڈاکٹر گوڑ کی شخصیت، ان کے سیاسی، سماجی اور ادبی کارناموں پر مضامین کا مجموعہ 'راج بہادر گوڑ: حیات اور ادبی کارنامے' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کو بھی مرتب کیا تھا۔

اردو زبان میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت، زندگی اور فن (تنقید نگاری) پر مضامین کے دو مجموعوں کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ان پر مضامین ملتے ہیں۔ان مضامین کو کمیونسٹ اور ٹریڈ یونین لیڈروں نے تحریر کیے ہیں۔تلاش کرنے پر ایسے مضامین انٹرنیٹ پر مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، کامریڈ راج بہادر گوڑ یا مجاہدِ اردو راج بہادر گوڑ 21 جولائی 1918ء کو حیدرآباد کے پرانے شہر کے ایک محلّہ 'گولی پورہ' میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام رائے محبوب رائے اور دادا ہری پرشاد گوڑ تھے جنھوں نے اتر پردیش سے حیدرآباد ہجرت کی تھی۔

حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں 'راج بہادر گوڑ: شخصیت اور کارنامے' کے عنوان سے غلام محمود نے پروفیسر محمد انوار الدین کی نگرانی میں سنہ 1996ء میں ایم فل کے لیے مقالہ تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی اسکولی تعلیم شاہ علی بنڈہ مڈل اسکول اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی اور سنہ 1936ء میں درجہ اول سے میٹرک پاس کیا۔میٹرک کے بعد جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کیا اور سنہ 1943ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج سے اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔

دورانِ تعلیم ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا رجحان کمیونزم کی جانب ہوگیا تھا اور انھوں نے 1939ء میں حیدرآباد میں غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی جو ان کی زندگی کے آخر تک برقرار رہی۔کمیونسٹ پارٹی میں ڈاکٹر گوڑ کی ملاقات مخدوم محی الدین سے اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں سے ہوئی۔مخدوم سے ان کی گہری دوستی تھی۔مخدوم سے اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے اپنے گھر پر مخدوم کی نظم 'چنبیلی کا منڈوا' کی تختی لگا رکھی تھی۔

کمیونسٹ تحریک اور ٹریڈ یونین ازم سے وابستہ ہونے پر ڈاکٹر گوڑ کو چند مرتبہ روپوش ہونا اور جیل بھی جانا پڑا۔ جیل سے فرار بھی ہوئے۔ سنہ 1952ء میں ڈاکٹر گوڑ کا راجیہ سبھا کے لیے انتخاب عمل میں آیا اور وہ دس سال تک ہندوستانی پارلیمان کے دو معیاد کے لیے رکن رہے۔ پارٹی تیسری مرتبہ بھی انھیں پارلیمنٹ کا ممبر بنانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر گوڑ نے منع کر دیا کہ اب دوسروں کو موقع ملنا چاہیے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے ہم خیال اور کمیونسٹ پارٹی کی کارکن جوان کے ساتھ جیل میں تھیں کامریڈ برج رانی سے روپوشی کے دور میں شادی کر لی اور انھیں دو لڑکیاں ڈاکٹر تمارا گوڑ اور کلارا گوڑ ہیں۔

لوگ راج بہادر گوڑ صاحب کو تین القاب سے یاد کرتے ہیں اور یہ تین القاب ڈاکٹر، کامریڈ اور مجاہد اردو، ان کی شخصیت کے تین اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ انھیں اپنی مادری زبان اردو کے ذریعہ ایم بی بی ایس کی سند حاصل کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے لیکن انھوں نے صحت وطبابت کا پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ دوران تعلیم ہی وہ کمیونسٹ تحریک سے متاثر ہو کر اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑنا چاہتے تھے لیکن بزرگوں کی خواہش اور اصرار پر انھیں تعلیم مکمل کرنی پڑی۔ ایک انٹرویو میں ڈاکٹر گوڑ نے بتایا۔

'کالج میں اساتذہ صاحبان کو اطلاع تھی کہ میں کمیونسٹ نظریات کا حامل ہوں اور فعال کارکن ہوں۔ اس زمانے میں اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ میں اس کی وجہ سے ایک استاد کی ناراضگی کا شکار بھی ہوا۔ میرا ایک پیپر فائنل میں رہ گیا۔ میں بے نیاز تھا لیکن سمجھانے پر میں نے کورس کی تکمیل کر لی اور ڈگری حاصل کر لی۔ شاید صرف ایک بار میں نے دردِ سر کی گولی کے لیے نسخہ بھی لکھا۔ اس پیشہ میں سرگرم ہونے کے بجائے میں نے غریبوں، مظلوموں اور بے بسوں کی مدد کا راستہ اپنے لیے منتخب کیا اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے یہ الفاظ سن کر پروفیسر فاطمہ پروین لکھتی ہیں کہ 'لوگ ایم بی بی ایس کی ڈگری کے لیے لاکھوں خرچ کرتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے بعد اس سے کروڑوں

حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو مادّیت کا شکار ہوتے ہیں، جو خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت دینا چاہتے ہیں وہ اپنے لیے عمل کی راہ اپناتے ہیں۔'

راج بہادر گوڑ صاحب کی شخصیت کا دوسرا اہم پہلو کامریڈ راج بہادر گوڑ ہے جس میں وہ ایک انقلابی، کمیونسٹ راہنما اور ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ تعلیم کے دوران ہی سے کامریڈ گوڑ سیاسی امور میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ جب وہ میڈیکل کالج میں تھے تو ان کا رجحان کمیونزم کی جانب ہو گیا تھا اور تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ سرگرم سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے وہ اپنی تعلیم ترک کرنا چاہتے تھے لیکن بزرگوں کا مشورہ مان کر ڈگری کے حصول تک تعلیم جاری رکھی اور سند حاصل کرلی۔ حصول تعلیم کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں اور وہ کامریڈ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کیے گئے۔ کامریڈ گوڑ کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کے دوران مختلف عہدوں پر فائز رہے اور مثالی خدمات انجام دیں۔

آزادی کے بعد ملک میں ٹریڈ یونین ازم کے آغاز سے کامریڈ راج بہادر گوڑ اپنے قریبی دوست کامریڈ مخدوم محی الدین کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ دونوں ساتھ میں کئی یونین جیسے اسپننگ ملز مزدور یونین، ٹیکسٹائل مزدور یونین، این ایم ڈی سی اسٹاف یونین، آئی ڈی پی ایل ایمپلائز یونین، اے پی ایس آر ٹی سی ایمپلائز یونین، آندھرا پردیش میڈیکل ایمپلائز یونین، آندھرا پردیش بینک ایمپلائز فیڈریشن وغیرہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

بحیثیت ٹرید یونین لیڈر کامریڈ راج بہادر گوڑ کی کارکردگی کے بارے میں قمر جمالی صاحبہ اپنے مضمون 'مردِ آہن۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ' میں لکھتی ہیں کہ 'انتظامیہ کے تعلق سے سخت رویّہ رکھنے کے باوجود انتظامیہ کی دشواریوں کا ہمدردانہ ادراک رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ اندھی مخاصمت نہیں بلکہ دانش مندانہ مفاہمت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انتظامیہ ان کی اکثر باتوں کو مان لیتا تھا وہیں ملازمین ان پر بھرپور بھروسہ رکھتے تھے۔ ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو جو مقام ہندوستان میں حاصل تھا وہ کم لوگوں کی قسمت میں آیا ہے۔ ٹریڈ یونین قائدین انھیں ٹریڈ یونین تحریک کے 'بھشم پتاما' کہتے تھے۔'

راج بہادر گوڑ صاحب کی شخصیت کا تیسرا پہلو ان کی مادری زبان اردو سے محبت ہے۔ گوڑ صاحب کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ حیدرآباد کے کائستھ گھرانوں کی مادری زبان اردو رہی ہے اور یہ گھرانے علم وادب دوستی کے لیے مشہور بھی رہے ہیں۔ گوڑ صاحب بڑی دلچسپ بات کہتے تھے کہ اردو ان کی مادری زبان اور انگریزی 'سوتیلی مادری زبان' ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اردو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'اردو بہرحال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں۔ اس کا لوک اَدھار یہیں ہے۔ اس کے بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور اردو ان سب کی مادری زبان ہے۔' انھوں نے اپنے آپ کو اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ملک کے طول وعرض میں اردو زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی مخالفت میں انھوں نے ہمیشہ آواز اٹھائی اور اسے اس کا حق دلانے کے لیے جدوجہد کی۔ اس بنا پر انھیں بجا طور پر مجاہدِ اردو کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے کی کوششوں کے لیے یاد رکھے جانے والے مجاہدِ اردو راج بہادر گوڑ اردو کے ایک ممتاز ادیب، صحافی اور نقاد بھی تھے۔

مجاہد اردو راج بہادر گوڑ کو اسکول کے زمانے ہی سے اردو ادب اور اردو تہذیب سے دلچسپی اور انسیت تھی۔ اسکول کے اساتذہ جناب مشتاق احمد اور جناب صدق حسین جائسی نے اردو ادب اور شاعری سے دلچسپی پیدا کی۔ گھر میں وہ اپنے چچا رائے محبوب نارائن جو ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھے سے بہت متاثر تھے اور انھیں اپنا آئیڈیل مانتے تھے۔ رائے محبوب نارائن کی بیٹی اور گوڑ صاحب کی چچازاد بہن اودیش رانی باوا اردو کی ادیبہ اور کالم نگار ہیں۔ ادب سے گوڑ صاحب کی انسیت اور لگاؤ ان کے دوستوں مخدوم محی الدین، ڈاکٹر حسینی شاہد، زینت ساجدہ، ڈاکٹر سید عبدالمنان، سری نواس لاہوٹی، مرزا ظفر الحسن اور دوسرے دوستوں کے سبب بھی تھا۔

مجاہد اردو راج بہادر گوڑ کو مطالعہ کا شوق اور کتابوں سے بہت محبت تھی۔ فرصت ہوتی تو گوڑ صاحب مطالعہ میں گھنٹوں صرف کیا کرتے تھے۔ معروف افسانہ نگار قمر جمالی صاحبہ کے ایک سوال کہ کیا ابھی لکھنا پڑھنا جاری ہے؟ کے جواب میں بیانوے سال کی عمر میں گوڑ صاحب نے جواب دیا تھا کہ 'پڑھوں گا نہیں تو جیوں گا کیسے! مر نہ جاؤں گا۔۔۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو مطالعہ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس لیے انھیں کتابیں بہت پسند تھیں۔ وہ کتابوں کا بہت خیال رکھا کرتے تھے اور ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ کتابیں خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں اودیش رانی صاحبہ لکھتی ہیں۔ 'راجن بھیا کو انسانوں کے بعد سب سے عزیز ترین شے کتاب ہے۔ وہ کسی بھی کتاب کے حاشیے پر لکھیں گے نہیں اور بغیر ترک کے کتاب پڑھیں گے نہیں۔ کتاب خرید کر پڑھیں گے تاکہ اس کی حفاظت کا خیال ہو۔ جب کبھی کوئی صاحب، کتاب مستعار لیں اور پھر اسے واپس کرنے کا خیال قرضِ حسنہ کی طرح ہنس کر ٹالنا ہو تو یہ راجن بھیا کو ناراض کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ ناراضگی بھی سوڈا واٹر کی طرح ہوتی ہے، بس ابلی اور پھر خاموش۔۔۔'

کتابیں خریدنے اور مطالعہ کا شوق کے موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی لکھا ہے۔ 'گوڑ صاحب اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ سیاسی سرگرمیوں میں گزرا ہے۔ اس کے باوجود ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ تحفے میں ملنے والی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ جب بھی دہلی آتے ہیں تو اردو گھر ضرور آتے ہیں۔ اردو گھر آتے ہیں تو بُک ڈپو جاتے ہیں اور کتابیں ضرور خریدتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انجمن کی بُک ڈپو کے مقروض رہتے ہیں۔ جب بھی اردو گھر آتے ہیں پچھلا حساب چکاتے ہیں اور قرض پر نئی کتابیں خریدتے ہیں۔ حیدرآباد میں ان کی ذاتی لائبریری میں انگریزی اور اردو کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ٹریڈ یونین کے لیڈر کی حیثیت سے گوڑ صاحب کو بہت سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ سفر ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ کیوں کہ سفر کے دوران انھیں مطالعے کا شوق پورا کرنے کی فرصت مل جاتی تھی۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بہت جلد لکھنا شروع کیا تھا اور سیاسی، سماجی، اردو اور مسلم مسائل اور سیکولر معاشرت پر بہت لکھا بھی ہے۔ ڈاکٹر گوڑ کا پہلا مضمون سنہ 1934ء میں 'پیام' حیدرآباد جس کے مدیر قاضی عبدالغفار تھے میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت گوڑ صاحب اسکول میں تھے اور میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ ہفت روزہ 'حیات' میں ڈاکٹر گوڑ نے 'میرا کالم' کے عنوان سے کچھ عرصہ کے لیے (چار سال تک) کالم بھی تحریر کیا تھا۔ اس کالم میں اردو اور مسلمانوں کے مسائل زیرِ بحث لائے جاتے

تھے۔ڈاکٹر گوڑ کمیونسٹ پارٹی کا نظریاتی ماہ نامہ 'کمیونسٹ جائزہ' کے کچھ عرصہ کے لیے ایڈیٹر بھی تھے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تخلیقی ادیب نہیں تھے۔ثبوت نہیں ملتے کہ انھوں نے شاعری یا افسانہ نگاری کی ہے لیکن گوڑ صاحب ڈاکٹر گوڑ نے اردو شعر و ادب اور تنقید سے متعلق کئی مضامین لکھے اور کتابوں پر تبصرے بھی کیے جو مختلف ادبی رسالوں بشمول روزنامہ 'سیاست'، حیدرآباد اور ہفت روزہ 'حیات' میں شائع ہوئے ہیں۔ان تنقیدی مضامین اور تبصروں کے علاوہ کئی اہم ادبی شخصیتوں بشمول اقبال، مخدوم، فراق، جوش پر ڈاکٹر گوڑ نے مضامین بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر گوڑ کی ادبی اور تنقیدی تحریروں کے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم 'ادبی تناظر' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ 'نظریاتی اعتبار سے گوڑ صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔وہ ادب اور زندگی کے باہمی روابط اور ادب کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ادب کو زندگی کے معاشی اور طبقاتی رشتوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ادب میں صرف مقصدیت ہی کو نہیں، اس کی ہئیت، اسلوب کی خوب صورتی اور جمالیاتی حسن کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔گوڑ صاحب قدیم اور جدید ادب دونوں کا احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں کی تخلیقات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔نقاد کی حیثیت سے ان کا رویّہ ایک سخت گیر اور اپنی علمیت کا لوہا منوانے والے نقاد کا نہیں بلکہ ایک ہمدرد ہم سفر کا ہوتا ہے۔'

ڈاکٹر گوڑ کے ادبی اور تنقیدی مضامین اور تبصروں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'ادبی مطالعے' ہے جسے سنہ 1978ء میں انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش نے شائع کیا تھا۔اس مجموعے میں تیرہ مضامین شامل ہیں۔

دوسرا مجموعہ 'ادبی جائزے' ہے جسے بشیر احمد نے مرتب کیا اور دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی نے سنہ 1990ء میں شائع کیا ہے۔

'ادبی تناظر' تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو، نئی دہلی نے سنہ 1991ء میں شائع کیا ہے۔اس میں اٹھارہ تنقیدی مقالے اور تبصرے شامل ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے ادبی اور تنقیدی مضامین کے تینوں مجموعے ادبی مطالعے، ادبی جائزے اور ادبی تناظر ریختہ کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر گوڑ کا کلیدی نوٹ جو انھوں نے انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش کے سالانہ اجتماعات سنہ 1980ء اور سنہ 1984ء میں دیے تھے، کتابچوں کی شکل میں یہ بھی ریختہ (www.rekhta.org) پر موجود ہیں جہاں سے ان سبھی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے صرف اردو میں ہی نہیں انگریزی زبان میں بھی اردو ادب پر مضامین لکھے ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ 'Random Writings' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں مخدوم، اقبال، فیض، پریم چند، فراق، حسرت موہانی اور دوسروں پر مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گوڑ صاحب نے مخدوم محی الدین پر انگریزی زبان میں ایک کتابچہ بھی لکھا ہے۔

ڈاکٹر لئیق صلاح، سابق سکریٹری، کرناٹک اردو اکیڈیمی لکھتی ہیں کہ 'اردو کے لیے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ بلکہ مزید اضافے کی توقع ہے۔ آج اردو کو جو ایک خاص طبقے سے جوڑا گیا ہے اور جسے ایک خاص فرقے کی زبان کہہ کر محدود کیا گیا ہے اس پس منظر میں راج صاحب جیسی ہستیاں ہمارے لیے قابل قدر ہیں۔ ان کی وجہ سے ہم یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ اردو کسی مخصوص فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ اس کا حلقہ بہت ہی وسیع ہے۔ اس سے بلالحاظ مذہب وملت سب ہی وابستہ ہیں۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بنیادی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں لیکن ان کی اردو زبان وتہذیب سے گہری وابستگی کے تعلق سے علی ظہیر لکھتے ہیں کہ 'وہ اردو زبان کے سپاہی پہلے اور پارٹی کے ورکر بعد میں نظر آتے تھے۔ دراصل جس خلوص اور دل سوزی سے وہ اردو کاز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے وہ اتنا پراثر ہوتا کہ ہمیں ان کا کمیونسٹ ہونا یاد ہی نہ آتا۔'

ڈاکٹر گوڑ سنہ 1954ء سے انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش اور ہند کے تاحیات رکن (لائف ممبر) تھے اور انجمن کے مختلف عہدوں بشمول نائب صدر و صدر پر فائز رہے۔ ڈاکٹر گوڑ انجمن

کے قائم کردہ اداروں جیسے اردو ماڈل اسکول، اردو آرٹس کالج، اردو اورینٹل کالج کے فعال رکن بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ کل ہند ترقی پسند مصنفین کی جماعت میں بھی شامل رہے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ گجرال کمیٹی کے رکن بھی تھے جو حکومت ہند کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے تجاویز پیش کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ سردار جعفری کمیٹی رپورٹ کے بھی وہ رکن رہے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔ اردو زبان وادب سے دلچسپی کے سبب ڈاکٹر گوڑ کو شہر کے بعض معیاری علمی وادبی اداروں جیسے ادبی ٹرسٹ وغیرہ کے ایک اہم رکن کی حیثیت حاصل تھی اور آپ کو شہر کی اردو محفلوں میں بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اردو تحریک کے ایک اہم راہنما تھے۔ انھیں دستور ہند میں اردو سے متعلق جتنی دفعات تھیں ان کا بخوبی علم تھا اور وہ مدلل انداز میں اردو کے حق کی بات رکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوڑ پارلیمنٹ میں اردو زبان کے حق میں اردو میں تقاریر کرتے جو بڑی توجہ سے سنی جاتی تھیں اور دوسرے دن اردو اخباروں کی سرخیاں بنتی تھیں۔

ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کے بولنے والے اپنی زبان کی بقا، ترقی اور ترویج کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ عمومی طور پر ہمارے ملک میں سہ لسانی فارمولا رائج ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں قومی سرکاری زبان ہندی کا راست تصادم اردو سے تھا، ان ہندی ریاستوں میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے سہ لسانی فارمولہ، ہندی، انگریزی اور اردو کی وکالت کی جبکہ ان کا خیال تھا کہ غیر ہندی ریاستوں میں سہ لسانی نہیں چہار لسانی فارمولہ ہندی، انگریزی، اردو اور علاقائی زبان (تلگو، کنڑی، ٹامل، مراٹھی وغیرہ) ہونا چاہیے۔ یکسانیت کے لیے ہندی ریاستوں میں بھی چہار لسانی فارمولے کے نفاذ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ہندی، انگریزی اور اردو کے ساتھ ایک جدید ہندوستانی زبان کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ملک میں عملاً سہ لسانی فارمولہ ہی لاگو رہا اور اردو اور کوئی جنوبی ہند کی زبان کی جگہ سنسکرت کی پرزور وکالت اور نفاذ ہونے لگا ہے۔ یوں اردو زبان اور تہذیب کا خاصہ نقصان ہوا اور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی اردو کی حمایت میں تقاریر اور انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاسوں

میں کلیدی خطبات سے چند اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں جن سے اردو زبان کو درپیش مسائل سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ اردو کو مسلمانوں اوران کے مذہب کے ساتھ محدود کر دینا اردو اور اسلام دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ زبان وادب اور تہذیبی ارتقا کے قوانین سے انحراف ہے۔

☆ اردو والوں کو کسی خوش گمانی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو کو اس کا حق ملنے تک جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور یہ مختلف تہذیبوں کی ترجمان ہے اور خاص کر جنگ آزادی کی زبان ہے۔

☆ آج ملک کی تقریباً ان سبھی ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والے قابلِ لحاظ تعداد میں بستے ہیں اردو اکاڈیمیوں کا قیام اوران اکاڈیمیوں کی سرکاری سرپرستی سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ اردو کی اہمیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے لیکن صرف اکاڈیمیوں کے قیام سے اصل مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو ریاست کے نظم ونسق اور تعلیمی نظام میں مناسب جگہ حاصل رہے۔ اردو کو نظم ونسق میں جگہ ہوتی تو اردو سیکھنے کا جواز بھی پیدا ہوگا اور پھر تعلیمی نظام میں اسے جگہ دی جا سکے گی اور یہی ہمارے ملک کی دفعات 345 اور 347 میں کہا گیا ہے اور گجرال کمیٹی نے بھی یہی سفارش کی ہے کہ اردو کو دفعہ 345 کے تحت متعلقہ ریاست میں سرکاری اغراض کے لیے استعمال کرنے کی سرکاری زبان کے قانون میں گنجائش فراہم کی جائے اور تعلیمی نظام میں سہ لسانی فارمولے میں اردو تعلیم کے مواقع مہیا کئے جائیں۔

☆ اردو کا سوال ایک جمہوری سوال ہے۔ اردو بولنے والوں کے مذہب، سیاسی رجحان یا عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک تہذیبی، عوامی اور جمہوری سوال ہے اور ہم اسی زاویے سے اسے دیکھتے ہیں۔ اسی انداز سے اس کا حل چاہتے ہیں اور اسی لیے سبھی نیک نیت لوگوں اور جمہوریت پسندوں کی حمایت کے طلب گار ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی اردو زبان سے محبت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب انھیں بحیثیت ممبر پارلیمنٹ وظیفے کا بقایا ملا تو انھوں نے اس میں سے تین لاکھ روپے کا عطیہ انجمن ترقی اردو کو طالب

علموں کے وظائف کے لیے دیا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی سوانح جب بھی لکھی جائے گی یا ان کے متعلق بات ہوگی تو اس میں انقلابی شاعر اور کامریڈ مخدوم محی الدین کا ذکر آنا لازمی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو کے علاوہ ڈاکٹر گوڑ کی ایک اور کمزوری تھی اور وہ مخدوم محی الدین تھے۔ گو کہ مخدوم ڈاکٹر گوڑ سے دس برس بڑے تھے لیکن ان دونوں کی دوستی کے قصّے بہت مشہور ہیں۔ حیدرآباد شہر کے ادیبوں نے بھی ان کی دوستی پر لکھا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں۔

'راج بہادر گوڑ اور مخدوم، مخدوم اور راج بہادر گوڑ دو الگ شخصیتیں ہونے کے باوجود دونوں ایک ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے رفیق، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل۔ مخدوم کو جتنا اعتماد گوڑ صاحب پر تھا اتنا کسی اور پر نہیں تھا اور گوڑ صاحب کو جتنا یقین مخدوم پر تھا کسی اور پر نہیں۔ دونوں میں چند خصوصیات مشترک بھی نظر آتی ہیں۔ دونوں آزادی کے مجاہد، دونوں مزدوروں کے چارہ گر، دونوں کمیونسٹ مگر معتدل، دونوں نے ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ ساتھ ہی جیل بھی گئے، روپوش بھی رہے، جیل سے ساتھ ہی فرار بھی ہوئے۔ دونوں ادبی میدان کے شہسوار، ایک کا میدان تخلیق تو دوسرے کا تنقید۔ مخدوم کے بعد گوڑ صاحب جیسے بھرے پرے حیدرآباد میں اکیلے سے ہوگئے تھے۔ دوست، احباب، طلب گار استعانت، مزدور و مجبور لوگوں نے انھیں ان کے مشن کا سلسلہ جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حقیقت پسند انسان تھے اور انھیں انسانی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایم بی بی ایس کی سندر کھنے کے باوجود پیشہ طبابت کو نہیں اپنایا کہ وہ دیگر مصروفیات اور دلچسپیوں کے سبب مریضوں سے انصاف نہیں کر پائیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی جب انھیں تیسری معیاد کے لیے راجیہ سبھا میں نامزد کرنا چاہا تو گوڑ صاحب نے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کو دو معیاد سے زیادہ پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے لوگوں کو بھی موقع ملنا چاہیے۔

ڈاکٹر گوڑ جب پچھتر برس کے ہوگئے تو انھوں نے بتدریج عملی سیاست اور ٹریڈ یونین کے عہدوں سے سبکدوش ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس ضمن میں شمیم فیضی لکھتے ہیں کہ 'ایسی بہت کم مثالیں ہیں

کہ سیاسی رہنما نے ایک عمر کے بعد عہدوں کو ترک کیا اور عملی سیاست سے سبکدوشی اختیار کی۔ راج نے یہ مثال قائم کی جو قابلِ تقلید ہے۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت چوں کہ دکن میں ہوئی تھی ان کی طبیعت میں یہاں کی شگفتگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی۔ اس ضمن میں پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں کہ 'راج صاحب اپنی گفتگو کے دوران فی البدیہہ مزاح، ذکاوت اور پن (Pun) کا مظاہرہ کرتے اور مختلف زاویوں سے حاضرین کے سامنے موضوع کے مطابق سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتے کرتے شگفتگی اور ظرافت سے ماحول کو خوش گوار بنا دیتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔۔۔'

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جو ایک ڈاکٹر، سیاست دان، کمیونسٹ، ٹریڈ یونین لیڈر، صحافی اور ان سب سے بڑھ کر اردو کے ایک سچے عاشق اور مجاہد، ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے کا انتقال 93 سال کی عمر میں 7 اکٹوبر 2011ء میں ان کے اپنے شہر حیدر آباد میں ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسدِ خاکی کو بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج کے حوالے کیا گیا۔

ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی

مجھے یاد ہے کہ 1970 کی دہائی میں جب میرا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا تھا میری ملاقات شہر کے ایک سینئر ڈاکٹر سے ہوئی تھی جنھوں نے اردو میڈیم سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور انھوں نے اپنی مرتب کردہ لطیفوں کی کتاب مجھے تحفتاً دی تھی۔

برادرم حقانی القاسمی کے کتابی سلسلہ 'اندازِ بیان 3' کے لیے 'جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور میڈیکل ڈاکٹرس' کے عنوان سے مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو موصوف کی یاد آنے لگی۔ میں نے موصوف کا تذکرہ جناب محمد عبدالرحیم خان (سکریٹری انجمن ترقی اردو، حیدرآباد) سے کیا اور ہم دونوں پرانی یادوں اور باتوں کو کریدتے اور تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی اور ان کی قائم کردہ 'ترانہ سوسائٹی' اور ان کے گھر بنام 'ترانہ بلڈنگ' تک پہنچے۔ اردو ہال کی سنٹرل لائبریری، حمایت نگر میں مجھے ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی کی کتاب 'ذرا مسکرادو' بھی مل گئی۔

'ذرا مسکرادو' دراصل ایک ہزار پانچ سو پچاس لطیفوں کا انتخاب ہے۔ لطیفوں کو پچپن مختلف عنوانات کے تحت جمع کر کے اور عنوانات کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی نے مرتب کر کے سنہ 1970ء میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب تین سو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اور اس وقت کتاب کی قیمت صرف پانچ روپے رکھی گئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ 1982ء میں شائع ہوا ہے۔ دونوں ایڈیشن ریختہ ڈاٹ آرگ (www.rekhta.org) پر

مطالعہ کے لیے موجود ہیں۔

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کہتے ہیں کہ 'زندگی کی تلخیوں کا واحد علاج مسکراہٹ ہے' اور انھوں نے زندگی کی تلخیوں پر مسکرانے، ہنسنے، قہقہے لگانے، طنز کرنے اور ان کا مذاق اڑانے کے لیے لطیفوں کے انتخاب کو پیش کیا ہے۔لطیفوں کی اس کتاب کو ڈاکٹر صاحب نے ایک ہندوستانی مونا لیزا کے نام معنون کیا ہے۔وہ اپنی مونا لیزا کی مسکراہٹوں پر ہزاروں گلستان بھی قربان کرتے ہیں۔

اس کتاب میں لطیفوں کے علاوہ پانچ کارٹون، غالب کی ایک غزل کی پیروڈی اور ایک مزاحیہ قطعہ (کثرت ازدواج) شامل ہے۔پیروڈی کا مطلع خوب ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

تجھ میں دھک دھک کی یہ صدا کیا ہے

معلوم نہیں کہ پیروڈی خود ڈاکٹر صاحب نے لکھی ہے اور کیا کارٹون بھی انہیں کے بنائے ہوئے ہیں۔ان کے علاوہ کتاب میں دو صفحوں اور مختلف صفحات پر تبسم، مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہہ سے متعلق اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔یہ انتخاب دلچسپ ہے۔کتاب میں مزید دلچسپی کا باعث ایک صفحہ پر 'بہترین' کے عنوان سے پندرہ باتیں اور خوبیاں بتائی گئی ہیں۔مثال کے طور پر سب سے بہترین اخلاق 'مسکراہٹ'، سب سے بہترین دوا 'قہقہہ' اور مرد کی بہترین ایجاد 'لطیفہ' بتایا گیا ہے۔کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں لطیفوں کے علاوہ دیگر دلچسپیوں کا سامان بھی مہیا کیا گیا ہے۔

'سرگذشت' کے عنوان سے خود کے اور 'بازگشت' کے زیرِ عنوان لطیفہ کے بارے میں ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کے تحریر کردہ دو مضامین بھی کتاب کے ابتدا میں موجود ہیں۔ان مضامین سے مصنف اور لطیفہ سے متعلق ہمیں خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ہمارے لیے اپنی ایک مسکراتی تصویر بھی دی ہے۔

پانچ صفحات پر مشتمل سرگذشت لکھنے کا سبب ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی دلچسپ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ 'چونکہ میں یارانِ طریقت کی طبیعت سے واقف ہوں جو خواہ مخواہ دوسروں کے خانگی معاملات خصوصاً پریشان کن حالات معلوم کرنے کے لیے بے حد کوشاں رہتے ہیں، ان کی تسکین کے

لیے اپنے بار گراں حالات گوش گزار کر رہا ہوں۔'

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی 12 ڈسمبر 1919ء کو شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔سرکاری اسکول، چادر گھاٹ سے سنہ 1937ء میں میٹرک اور دو سال بعد سنہ 1939ء میں جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کیا۔انٹرمیڈیٹ کے بعد عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخلہ ملا اور سنہ 1944ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ڈاکٹر بننے کے بعد ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی اسی کالج میں شعبہ پتھالوجی میں لکچراری پر معمور ہوئے۔

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کی شادی سنہ 1947ء میں ہوئی اور صاحب اولاد بھی ہو گئے۔سنہ 1952ء میں ان کے شیر خوار بیٹے سکندر طاہر جنھیں 'نمائشِ اطفال' میں ایک ہزار بچوں کے مقابلے میں انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا تھا، کی نا گہانی موت سے دل برداشتہ ہو کر امریکہ کوچ کر گئے۔ امریکہ میں چھ سال گزارنے کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ ساتویں سال وطن واپس ہوئے اور پھر سرکاری ملازمت سے رجوع ہوئے۔

امریکہ سے واپس ہونے پر ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کا تقرر سیول سرجن پتھالوجسٹ کی حیثیت سے کینسر ہاسپٹل پر کیا گیا۔پھر جلد ہی ان کا تبادلہ دق کے دواخانے پر ہوا۔دق کے دواخانے میں سات سال کی 'قید بامشقت' کے بعد پھر ایک مرتبہ ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔اس مرتبہ انسٹی ٹیوٹ آف پریونٹیو میڈیسن، نارائن گوڑہ پر وہی پرانے عہدہ پر تقرر ہوا۔سرکاری ملازمت میں وقفہ وقفہ سے ہونے والے تبادلوں کے سبب ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں دلچسپی اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور اچاٹ دل کو بہلانے کے لیے مزاح (لطیفہ گوئی) کا سہارا لینا پڑا۔یوں ایک سائنٹسٹ ظریف اور لطیفہ گو بن گیا۔وہ لکھتے ہیں۔

'ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور نیچروپیتھی کی تعلیم کے بعد لطیفہ پیتھی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مزاج اور مزاح میں صرف ایک نقطہ کا ہی فرق تو ہے۔ڈاکٹر علاج کے ساتھ تھوڑی بذلہ سنجی سے کام لے تو کڑوی دوا میں بھی مٹھاس پڑ جاتی ہے اور مریض عقیدہ اور بھروسہ (Faith & Confidence) کے سہارے صحت کی منزل مسکراتے ہوئے جلد پا لیتا ہے۔کسی ڈاکٹر، حکیم یا وید

کو صرف چارہ گر سمجھ لینا غلطی ہے۔ بقول مخدوم اس کی زنبیل میں نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے۔ان کا اشارہ مزاح اور بذلہ سنجی کی طرف ہے ورنہ اگر ڈاکٹر لوگ بھی مرضِ عشق میں مبتلا ہو جائیں تو فیس کون ادا کرے گا؟'

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی اپنے خاندان کے بارے میں ظریفانہ انداز میں بتاتے ہیں کہ 'یہ بھی قدرت کا عجیب قانون ہے کہ دادا اور پوتا بہت کم عرصہ تک ساتھ اس دنیا میں رہ سکتے ہیں۔اُدھر دادا حضور جنت میں داخل ہوتے ہیں تو اِدھر ناخلف پوتے جہنم ارضی میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔خدا کے فضل وکرم سے میرے والدین کا سایہ سلامت ہے اور اولا دیں خدا نے تین لڑکے اور تین لڑکیاں گویا تین مجھے اور تین میری بیوی کو عطا کی ہیں۔ففٹی۔ففٹی۔'

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کی اردو زبان وادب اور شاعری سے دلچسپی اور انسیت کا سبب ان کے اردو اساتذہ مولوی صدق جائسی اور محمد علی بیگ تھے۔ڈاکٹر صاحب کی رہائش حضرت فانی بدایونی کے گھر کے قریب تھی جو اردو زبان وادب سے مزید دلچسپی بڑھانے کی وجہ بنی۔فانی بدایونی سے اپنی قربت کا حال ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی یوں بیان کرتے ہیں۔

'حضرت فانی بدایونی کا مکان ملے پلی میں میرے مکان سے قریب تھا۔کالج کے بعد ہر شام ان کے ساتھ گزرتی،کبھی دیر ہو جائے تو فوراً یاد ہوتی اور اکثر محفلوں اور مشاعروں میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ان کے گھر ہر روز محفلِ شعر یا بزمِ ادب منعقد ہوتی۔جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری،شام اکبرآبادی،تابش لکھنوی، ماہرالقادری، امجد طباطبائی، ہوش یار جنگ، نثار یار جنگ، اصغر یار جنگ اور دیگر شعرا جمع رہتے۔شعر سناتے، گرما گرم بحث چلتی۔یہ شام بھی شام اودھ کی طرح خواب وخیال ہو کر رہ گئی لیکن میرے ذہن پر اردو کی عظمت کا ایک مستقل رنگ چھوڑ گئی۔'

لائق اور قابل اساتذہ اور نامور شعرا اور ادیبوں کی صحبت کے اثر میں ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی نے شعروشاعری میں طبع آزمائی کی۔غزلیں اور نظمیں لکھی جو زیادہ تر نامکمل رہ گئیں اور جنھیں کبھی سنانے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔انھیں فرصت بھی نہ تھی کہ اس جانب توجہ کرتے۔چند مضامین تحریر کیے جو اخبارات میں شائع ہوئے اور ریڈیو سے نشر بھی ہوئے۔افسوس کہ میری محدود تلاش میں ڈاکٹر

صاحب کی کوئی ادبی تخلیق ہاتھ نہیں لگی۔

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔موسیقی کے پروگراموں کے لیے ڈاکٹر صاحب نے نغمہ سوسائٹی اور ترانہ سوسائٹی بنائیں تھیں جن کے تحت موسیقی کے پروگرام کرتے تھے۔ اپنے نئے مکان کا نام بھی 'ترانہ' رکھا تھا جس میں موسیقی اور قوالیوں کے پروگراموں کے لیے ایک ہال بنوا رکھا تھا۔اس ہال میں کچھ عرصہ کے لیے نغمہ سوسائٹی کے تحت پابندی سے 'موسیقی جلسے' منعقد ہوتے رہے، پھر یہ سلسلہ رک گیا۔

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کی یہ مختصر روداد زندگی تھی جوان کے مطابق 'بہت اچھی ہے اور نہ بہت بری، صرف لائق شکر ہے۔'

اردو زبان وادب میں یوں تو لطیفوں کی کئی کتابیں ہیں۔ادیبوں اور شاعروں سے منسوب لطیفے بھی خوب شہرت رکھتے ہیں۔لطیفوں کی کتابوں کے چند عنوانات جیسے آب حیات کے لطیفے، غالب کے لطیفے، اکبرالہ آبادی کے لطیفے، سدابہار لطیفے، مجاز کے لطیفے، بہترین اردو لطیفے، فراق کے لطیفے، ادبی لطیفے اور لطیفے ہی لطیفے اس وقت یاد آرہے ہیں۔ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کی کتاب 'ذرا مسکرادو' گو لطیفوں کی کتاب ہے لیکن عنوان میں 'لطیفہ' (بطور اسم) نام نہیں ہے۔کتاب کے عنوان میں ڈاکٹر صاحب قارئین سے اپنی خواہش 'ذرا مسکرادو' کا سیدھا اظہار کرتے ہیں۔

ویسے ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کتاب کے عنوان اور ڈھیر سارے لطیفے اکٹھا کرنے کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ 'اس زعفران زار گلزار تبسم کا سادہ سا نام 'ذرا مسکرادو' رکھ دیا ہے تاکہ مسکرانے کے نام سے آپ کے دل میں تھوڑی سی گدگدی پیدا ہو۔ایک کرم فرما نے پوچھا۔'ڈاکٹر صاحب! آپ نے اتنے سارے لطیفے کہاں سے جمع کیے؟'

میں نے کہا۔'سوپر بازار سے۔۔۔' جواب سن کر ناراض ہوگئے۔پھر مخدوم کا یہ شعر پڑھ دیا۔

کچھ قوس قزح سے رنگت لی کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا کیف اڑایا بہاروں سے

پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو غالب کو درمیان میں لانا پڑا۔

سات دریا سے فراہم کیے ہوں گے موتی

تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

یہ سن کر مسکرادیے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ میں سات سمندر پار (امریکہ) میں سات سال گزار کر وطن واپس آیا ہوں۔'

قارئین سے ذرا مسکرادینے کی خواہش کو روبہ عمل لانے کے لیے جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مختلف عنوانات کے تحت لطیفوں کو نمبر دے کر پیش کیا گیا ہے یعنی ڈاکٹر صاحب نے 'لطیفہ شماری' کی کوشش کی ہے۔لطیفوں کو نمبر دے کر پیش کرنے کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتائی ہے کہ 'اگر لطیفہ آپ کو پسند آئے تو تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔'

اگر لطیفہ نمبر یاد نہ رہے تو۔۔۔ڈاکٹر صاحب نے اس کا طریقہ نہیں بتایا۔

'ذرا مسکرادو' کی خوبی یا اہمیت اس کتاب میں لطیفہ اور لطیفہ گوئی کے متعلق ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کا تحریر کردہ دلچسپ مضمون 'بازگشت' کی موجودگی ہے۔لطیفہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔'سچ تو یہ ہے کہ حضرت انسان کا وجود میں آنا ہی ایک لطیفہ سے کم نہیں۔ورنہ غور کیجیے کہ باوجود سخت تاکید کے حضرت آدم کا گندم کھالینا اور شیطان کے جھانسے میں آجانا، خلد بریں سے نکالا جانا اور حوا کی معرفت قسم قسم کے انسان پیدا کرنا۔یہ سب لطیفہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو ہنسنے اور ہنسانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔قہقہے اس کے بلند حوصلے کی ایک علامت ہے۔جو شخص مسکرانا بھول جائے سمجھ لیجیے کہ وہ پاگلوں کی دنیا میں آباد ہے۔'

لطیفہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے یہ خیالات پڑھ کر بے ساختہ ذہن میں ایک فلمی گانے کے بول گونجنے لگتے ہیں۔

زندگی کیا ہے ایک لطیفہ ہے

جینے کا یہی بس طریقہ ہے

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی نے لطیفہ اور لطیفہ گوئی سے متعلق بڑی گہری اور کارآمد باتیں لکھی

ہیں۔ طنز و مزاح سے دلچسپی اور طنز و مزاح نگار ہونے کے ناطے میرا خیال ہے کہ بہت کم لوگوں نے لطیفہ پر کام کیا ہے گو کہ ان لوگوں نے خوب لطیفے گھڑے ہیں۔ میں نے لطیفہ پر اس قسم کی جامع تحریر پہلے شاید ہی پڑھی ہے۔ مختصر لطیفہ پر نسبتاً طویل گفتگو کے باوجود ڈاکٹر صاحب انکساری سے لکھتے ہیں کہ 'اس موضوع پر تحقیقاتی مقالہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں!'

ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی لطیفہ کے حسن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'لطیفہ کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں لطیفوں کا پیراہن اس قدر مختصر کر دیا گیا کہ اس کا بدن صاف نظر آ جائے۔'

ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی لطیفہ کو یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ 'لطیفے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذاق سلیم پر بار نہ ہو۔ سماعت پر گراں نہ گزرے۔ اسی لیے لطیفہ کو روح فصاحت اور نشاطِ روح کا درجہ دیا گیا ہے۔ لطیفہ ایک نہائت ہی لطیف شے ہے جس کے بیان کے لیے ایک خاص قسم کی ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لطیفہ لکھنے کا ہے۔ کسی کو خوش کرنا ایک مستحسن فعل ہے۔ اہلِ ایمان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔ بذلہ سنجی سے عقل پر جلا ہوتی ہے۔

شاہانِ وقت کے دربار میں لطیفہ گو ذہین، دانا اور حاضر جوابی میں یکتا تھے۔ بالواسطہ طور پر وہ اتالیق، نگران، مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتے تھے جیسے بیربل، ملا دو پیازہ جو محض ظریف ہی نہ تھے بلکہ دربارِ اکبری کے نورتن اور وزیر باتدبیر بھی تھے۔ اب کوئی سعادت علی خان نہیں جو انشاء کے لطیفے سنے، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسنِ طلب کی داد دے۔ وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیوں کہ ان کے اب قدرداں نہیں۔ محمود و اکبر جیسے سرپرستوں کے ساتھ ساتھ فردوسی، سعدی، ابوالفضل اور بیربل جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا۔

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب تھے وہ لوگ

لطیفہ کے بارے میں قدرے تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی اردو

زبان وادب میں لطیفے کے مقام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ’اردو ادب میں کلاسیکی لطائف کا ذخیرہ بہت کم ہے لیکن طنز ومزاح کی بے شمار چنگاریاں دبی پڑی ہیں۔ دورِ حاضر اردو لطائف کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لطائف کو رفتہ رفتہ اپنا کھویا ہوا درجہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سامنے آرہے ہیں۔ ادبی رسائل اور اخبارات اچھے اور معیاری لطائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔ لطیفہ گوئی کی موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل واضح اور روشن ہے۔‘

حیرت ہوتی ہے کہ نصف صدی پہلے ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی نے لطیفہ کے تعلق سے جن خیالات یا لطیفہ کی تعریف میں جن خوبیوں کا ذکر کیا تھا آج سوشل میڈیا پر دھوم مچانے والے ریل (Reel)، شارٹس (Shorts)، میم (Meme) یا ٹک ٹاک (Tik Tok) کی شکل میں جو ویڈیوز ہیں وہ حرف بہ حرف صحیح نظر آتے ہیں۔

لطیفے کسی کی ملکیت یا میراث نہیں ہوتے اور عموماً انہیں جمع کیا جاتا ہے۔ اپنی کتاب میں جمع کیے ہوئے لطیفوں کی ملکیت کے بارے میں ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی لکھتے ہیں۔ ’اگر کسی کا دعویٰ ہو کہ کتاب کا کوئی لطیفہ ان کا ذاتی، موروثی، خانگی یا خاندانی ہے تو بھائی صاحب تمھارا ہی سہی مجھے تو اپنے ساتھ لے جانا نہیں ہے۔‘

جہاں لطیفے کسی کی میراث یا جاگیر نہیں ہوتے وہیں لطیفوں کو دہرانا نہایت عام بات ہوتی ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر آر۔ طاہر قریشی لکھتے ہیں۔ ’ممکن ہے لطیفوں کے اس مجموعے میں آپ کو چند لطیفے ایسے بھی ملیں جو پہلے سے آپ کی نظر سے گزرے ہوں۔ لیکن ایک حسین وجمیل عورت کی طرح ایک حسین لطیفہ سے دوبارہ ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جی خوش ہوتا ہے۔ روح کو بالیدگی عطا ہوتی ہے اور آنکھوں میں تراوٹ آتی ہے۔‘

لطیفہ دہرانے والی بات پر مجھے حیدرآباد شہر کے ایک معروف لطیفہ گو شریف اسلم کی یاد آگئی۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اسلم بھائی، یہ سنا ہوا لطیفہ ہے تو وہ کہتے۔ ’اسی لیے تو سنایا ہے کہ اس کی ریپیٹ ویلیو (Repeat Value) ہے۔ بعض لطیفے دہرائے جانے کے لیے ہی گھڑے جاتے ہیں

تو چند لطیفوں کو دہرانے سے وہ بہتر ہوتے ہیں۔'

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے اور اہلِ دکن کی زندہ دلی اور شگفتگی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ڈاکٹر صاحب اپنے انداز سے شگفتگی کے فائدوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔'اگر سیاست داں اپنی طویل تقریروں میں چند لطائف بھی شامل کرلیں تو خواہ ان کے وعدے پورے ہوں یا نہ ہوں لیکن لوگوں کو ہنسنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔' لگتا ہے کہ دور حاضر کے لیڈر اس مشورہ پر عمل پیرا ہیں۔

اسی پیراگراف کا یہ اقتباس بھی بہت سچا معلوم ہوتا ہے۔'کبھی ایک کانٹا بھی مسکرا کر پھول کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مسکرا کر گفتگو کرنے والے زیادہ عرصہ تک یاد رہ جاتے ہیں۔بعض وقت مسکراہٹ اور تبسم کا صرف تذکرہ بھی دل و دماغ پر خوشگوار اثر مرتب کردیتا ہے۔مجھے روتے ہوئے جینے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں، میرا تو عقیدہ ہے کہ ہنستے ہنستے مرنا بھی صحت کے لیے مفید ہے۔تندرستی ہزار نعمت ہے جنت میں بھی کام آئے گی۔زندگی کی آہ وزاری کو صرف قہقہوں کی گونج ہی دبا سکتی ہے۔

اک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

ہمارے ہندوستان میں اردو زبان کو بعض تنگ نظر سیاست دانوں نے تعصب کی صلیب پر لٹکا کر اہلِ کتاب کا درجہ دے دیا ہے لیکن اردو زندہ ہے اور زیرِ لب مسکرا رہی ہے۔'

کتاب میں جہاں لطیفہ کے بارے میں ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی نے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں وہیں قارئین سے ان کا یہ انوکھا التماس مجھے بہت پسند آیا کہ'یہ کتاب اپنی تمام غلطیوں کے ساتھ من وعن آپ کے سامنے آرہی ہے۔جہاں اصلاح کی ضرورت ہو آپ خود اصلاح کرلیجیے اور مجھ غریب کی جان بخشیے۔اگر پسند آئیں تو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیجیے، باقی دوسروں کی دماغ پاشی کے لیے چھوڑ دیجیے۔گلہ اور شکوہ کی اگر پرانی عادت ہے تو وہ بھی پوری کرلیجیے۔اپنے ناقص اور غیر ناقص مشوروں سے مطلع فرمائیے تاکہ آئندہ اشاعتوں میں شریک کرسکوں۔آج کل یہ شہرت عام ہے کہ

مسجدیں باقی ہیں مگر نمازی نہ رہے۔اگر آپ کی دلچسپی شامل حال رہی تو ہم اپنی عمر کے دن پورے ہونے سے پہلے ایک دو کتابوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ باقی مرضی اللہ کی۔ پھر ملیں گے، یہاں نہیں تو وہاں۔'

ڈاکٹر آر۔طاہر قریشی کے مضمون کا یہ پیرا گراف حقیقت پسندانہ اظہار کا نمونہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔'زندگی کے ساتھیو! کاروانِ سفر میں ہنستے مسکراتے اور قہقہے لگاتے ہوئے آخری منزل پر پہنچ جاؤ۔ جب تمھاری زبان بند ہو جائے گی تو چہرے پر صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ باقی رہ جائے گی۔'

اور پھر وہ دعا کرتے ہیں۔'خدایا تو اپنے بندوں کو زندہ دلی کی دولت سے مالا مال کر دے اور تمام افسردہ دلوں کو قہقہوں میں بدل دے۔'

میرے لبوں سے بے ساختہ نکل گیا۔' آمین، یارب العالمین۔'

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے انسانی امراض، صحت اور طبِّ جدید کے مختلف موضوعات پر اردو زبان میں معلومات آفرین اور دلچسپ مضامین میں اخبار 'سیاست' میں پڑھتا رہا ہوں۔ میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم کے دوران مرض فلوروسس (Fluorosis) پر ڈاکٹر صاحب کی گراں قدر تحقیق کا علم بھی ہوا تھا۔ شہر میں بڑے بزرگوں کو ان کے اور دوسرے ڈاکٹروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی سنا ہے لیکن کبھی ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی سے ملنے کا اس لیے موقع نہیں ملا کہ سنہ 1970ء میں جب میں دسویں جماعت میں تھا وہ حیدرآباد سے سعودی عرب اور پھر امریکہ ہجرت کر گئے تھے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے بارے میں لکھنے کے لیے معلومات اکٹھا کرنے لگا ہوں تو مجھے انٹرنیٹ پر 'منی سوٹا ز امیگرنٹس' نامی ویب سائٹ پر ڈاکٹر صاحب کا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا انٹرویو سننے کو ملا۔ اس ویب سائٹ پر ہجرت کر کے منی سوٹا، ریاست ہائے متحدہ، امریکہ آنے والوں کے انٹرویوز پیش کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی سے یہ انٹرویو 22 اگست 1994ء میں لیا گیا تھا۔ انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر سوالات کیے گئے اور ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے جوابات بھی دیے تھے۔ اس انٹرویو کے علاوہ مجھے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے انتقال پر ڈاکٹر مجید خان کا لکھا تعزیتی مضمون بھی ملا جو سیاست میں چھپا تھا۔ مجتبیٰ حسین کے دو ایک مضامین میں بھی ڈاکٹر

ابوالحسن صدیقی کا ذکر ملتا ہے۔ 'تذکرہ عثمانین' (نامور فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے حالات اور کارنامے) میں شاہ بلیغ الدین نے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے متعلق چار صفحوں کا مضمون تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی حیدرآباد کے متوسط خاندان میں 25 جولائی 1924ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی دو بہنیں تھیں اور ان کی پرورش مشترکہ خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا جہاں سے انھوں نے اردو ذریعہ تعلیم سے سنہ 1947ء میں ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔

شاہ بلیغ الدین لکھتے ہیں کہ سنہ 1947ء کے ایم بی بی ایس کا نتیجہ اخباروں میں شائع ہوا تو ان کی ذہانت کے چرچے ہونے لگے۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو اپنی جماعت میں اول آنے پر آصف جاہی حکومت کے وظیفہ پر انگلستان بھیجا گیا تھا۔ انگلستان میں ڈھائی سال کی تعلیم کے بعد لندن اور اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) سے ایم آر سی پی (MRCP - Member of Royal College of Physicians) کا ڈپلومہ حاصل کر کے سنہ 1951ء میں وطن لوٹے۔

ماضی میں جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹرس اردو کے ذریعہ ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کر کے اعلی تعلیم کے لیے انگلستان جاتے تھے جہاں جامعہ عثمانیہ کی ڈگری تسلیم کی جاتی تھی۔ اس تعلق سے ڈاکٹر مجید خان لکھتے ہیں۔ 'اکثر طلبا کی یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ اعلی تعلیم کے لیے انگلستان جائیں کیوں کہ دنیا کے کسی اور خطے کی اعلی تعلیم کی اتنی قدر نہیں تھی بشمول امریکہ کے۔ اس زمانے میں طلبا اعلی تعلیم کے لیے مغربی ممالک جایا کرتے تھے نہ کہ تلاش معاش میں اور پھر واپس وطن آجایا کرتے تھے جس طرح سے ڈاکٹر ابوالحسن صاحب نے کیا اور کے نقشِ قدم پر میں نے بھی کیا۔'

حیدرآباد واپس ہونے کے بعد محکمہ صحت وطبابت کے شعبۂ میڈیسن میں ڈاکٹر ابوالحسن کا تقرر ہوا۔ مریضوں کو دیکھنے کے ساتھ بچوں کو پڑھانا بھی آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی یافت 350 تا 500 روپے مہینہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو تحقیق سے دلچسپی تھی تو آپ نے مرض فلوروسس (Fluorosis) جو دانتوں اور ہڈیوں کا مرض ہے کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ یہ مرض حیدرآباد سے سو کیلومیٹر دور دراز کے علاقوں (ضلع نلگنڈہ) میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے تحقیق کر کے اس مرض کا سبب دریافت کیا کہ یہ مرض مقامی پینے کے پانی میں فلورین ماڈوں (Fluorides) کی زیادہ مقدار سے آلودگی پر ہوتا ہے۔آپ نے پانی سے فلورائڈس کم کرنے کا طریقہ بھی بتایا تھا جس سے اس مرض پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

مرض فلوروسس کے سبب کی دریافت اور انسداد پر مبنی آپ کا تحقیقی مقالہ شہرہ آفاق طبّی جریدہ 'برٹش میڈیکل جرنل' (BMJ - British Medical Journal) میں سنہ 1955ء میں شائع ہوا اور ادارۂ عالمی صحت (WHO) کے مونوگراف Fluoride and Human Health میں آپ کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔اس تحقیق کی بین الاقوامی سطح پر خوب پذیرائی ہوئی اور انھیں انگلستان سے فیلوشپ (ایف آر سی پی، FRCP) عطا کی گئی۔ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو عثمانیہ میڈیکل کالج میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی بھی دی گئی۔مختلف ملکوں کے تحقیقی اداروں نے انھیں فلوروسس اور اپنی تحقیق کے بارے میں لیکچرس دینے کے لیے مدعو بھی کیا تھا۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی اس عہدہ (پروفیسر شپ) پر زیادہ دن کام نہ کر سکے، پروفیسر بنتے ہی پیشہ ورانہ رقابتیں ابھرنے لگیں اور مختلف طریقوں سے انھیں پریشان کیا جانے لگا۔تنگ آ کر انھوں نے ملازمت سے سنہ 1968ء میں استعفی دے دیا اور خانگی پریکٹس کرنے لگے۔خانگی پریکٹس میں بھی ڈاکٹر صاحب مقبول اور کامیاب تھے لیکن جلد ہی انھوں نے سنہ 1970ء میں حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور سعودی عرب چلے گئے۔آثار بتلاتے ہیں کہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے دل برداشتہ ہو کر حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس بارے میں ڈاکٹر مجید خان لکھتے ہیں۔

'میں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ وہ حیدرآباد کو خیر باد کہیں گے۔ملازمت اچھی تھی۔ پرائیویٹ پریکٹس میں بڑے کامیاب اور مقبول تھے مگر خیالات اگر موافق نہ ہوں تو دل بہت جلد برداشتہ ہو جایا کرتے تھے۔انکم ٹیکس کی جھڑتی ہر مشہور ڈاکٹر کی ہوتی ہے، نہ کوئی متاثر ہوتا ہے نہ پریشان۔کسی نے شرارتاً شکایت کی اور ڈاکٹر صاحب بددل ہو گئے اور سعودی عرب چلے گئے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا بھرپور فائدہ ملک کو حاصل کرنا چاہیے تھا مگر ان کی صحیح قدر یہاں پر نہیں ہوئی۔آندھرائی حکمرانوں کے تعصب کا بھی غالباً وہ شکار رہے۔'

ڈاکٹر مجید خان نے تعصب کا شکار ہونے کی بات جو اپنے مضمون میں لکھی ہے یہی وجہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے اپنے انٹرویو میں بتائی کہ وہ وطن میں تعصب کا شکار ہوئے اور دل برداشتہ ہوکر حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی وطن چھوڑ کر سنہ 1970ء میں سعودی عرب گئے۔ سعودی عرب میں انھیں اچھی ملازمت ملی اور وہ مکہ المکرّمہ میں رہا کرتے تھے لیکن سعودی عرب میں مستقل رہائش کی سہولت بہت مشکل سے ملتی ہے بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب وہاں سے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے برطانیہ یا امریکہ منتقل ہونے کا پروگرام بنایا اور امریکہ کا انتخاب کیا۔

سعودی عرب میں رہتے ہوئے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے امریکہ کے امتحانات پاس کیے اور وہاں سے بہت جلد صرف چار سال بعد سنہ 1974ء میں منی سوٹا، امریکہ نقل مکانی کر لی۔ امریکہ ایسا ملک ہے جہاں دنیا بھر کے لوگ جانا چاہتے ہیں اور ایک مرتبہ وہاں پہنچنے کے بعد بہت کم لوگ واپس ہوتے یا کہیں اور جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے امریکہ کے دوسرے ممالک سے آنے والے ڈاکٹروں کے امتحانات پاس کیے اور نفسیات (سائیکاٹری، Psychiatry) میں ریسیڈنسی کی اور منی سوٹا کے سائیکاٹری دواخانے میں کام کرنے لگے۔ اپنی بقیہ زندگی ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاندان کے ساتھ وہیں گزار دی۔ ان کے نو پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں امریکہ ہی میں پیدا ہوئیں۔

منی سوٹا امیگرنٹس کو دیے گئے انٹرویو میں ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے بڑی دلچسپ باتیں کہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں امریکہ پہلے آجانا چاہیے تھا۔ وہ دیر کرکے پچاس سال کی عمر میں امریکہ پہنچے اور قدم جمانے کے لیے جدوجہد کی۔ اپنی شادی کے بارے میں بتایا کہ خاندان والوں کی مرضی سے ان کی شادی خالہ زاد بہن سے سنہ 1953ء میں ہوئی جو ان سے سات برس چھوٹی تھیں۔ شادی سے پہلے انھیں اور ان کی بیگم کو معلوم تھا کہ ان کی شادی ہونے والی ہے۔ کنبہ پروری اور خاندان میں شادی کرنا حیدرآبادیوں کا خاصہ ہے۔

انٹرویو میں ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے یہ بھی بتایا کہ انھیں مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ کام کے

دنوں میں انھیں مطالعہ کے لیے کم وقت ملتا تھا لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد ہر دن چھ سے آٹھ گھنٹے مطالعہ کر کے وہ اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ کلاسیکی ادب پڑھنا ڈاکٹر صاحب بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے پاس مختلف رسالے اور جرائد آتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو ڈاکٹر بننے کا شوق بچپن میں تیسری جماعت سے تھا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے خوب محنت سے پڑھائی کی، اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور ڈاکٹر بن گئے۔ وہ اپنے پیشہ سے مطمئن ہیں اور لوگوں کا علاج معالجہ کر کے انھیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔

تین ملکوں ہندوستان، سعودی عرب اور امریکہ میں صحت وطبابت سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے کہا کہ ان ملکوں کے مختلف احوال ہیں۔ ہندوستان کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ کہی کہ یہاں کے ڈاکٹروں کا رویّہ عامرانہ ہوتا ہے۔ ان کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کسی ڈاکٹر کا برتاؤ پسند نہ آئے تو آپ اسے چھوڑ کر دوسرے ڈاکٹر سے رجوع ہو سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہونے والے علاج معالجہ سے وہ مطمئن ہیں لیکن کہا کہ یہاں علاج معالجہ کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔

انٹرویو میں ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے بتایا کہ دل ٹوٹنے یا ڈاکٹر مجید خان کے الفاظ میں دل کھٹا ہونے پر انھوں نے حیدرآباد (انڈیا) کو سنہ 1970ء میں خیرباد کہا اور صرف ایک مرتبہ سنہ 1971ء میں چند دنوں کے لیے حیدرآباد گئے تھے لیکن بعد میں کبھی وطن نہیں گئے۔ دوست احباب انھیں بلاتے بھی رہے اور وہاں کی یادیں آتی بھی رہیں لیکن وہ کہتے ہیں ایک مرتبہ جو فیصلہ کرلیا تو اس پر قائم رہے!

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی گو کہنے کو حیدرآباد چھوڑ گئے لیکن وہ کبھی اپنوں کو بھلا سکے اور نہ کبھی اردو زبان سے دور ہو سکے۔ ہزاروں میل دور بیٹھے اپنوں کے رابطے میں رہتے تھے۔ ان کی خیریت دریافت کرتے اور گھنٹوں فون پر بات کرتے تھے۔ اردو کتابیں اور رسائل منگوا کر پڑھتے تھے۔ اخبار سیاست بذریعہ ڈاک ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو منی سوٹا، امریکہ بھیجا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی عثمانیہ میڈیکل کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز رہتے ہوئے

طالب علموں کو پڑھایا بھی تھا اور ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد بھی ہے۔ ڈاکٹر مجید خان ماہر نفسیات اور مضمون نگار ڈاکٹر صاحب کے شاگرد تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

'ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی میرے استاد محترم رہ چکے ہیں۔ میں نے ان سے بہت سیکھا ہے۔ سیاست میں طبّی موضوعات پر مضامین لکھنے کی تربیت بھی انھوں نے دی تھی۔۔۔ میرے مضامین بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے اور ہمیشہ ہمت افزائی کرتے رہے۔۔۔ وہ خود بھی بڑے شوق سے لکھا کرتے تھے۔ ان کو انگریزی اصطلاحات کا خاص ترجمہ اردو میں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ مجھ سے اکثر دریافت کرتے تھے کہ مجید بولو! یہ ترجمہ کیسا تھا۔ میں مذاقاً کہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یونانی اصطلاحات استعمال کررہے ہیں۔'

یونانی طب کے ذکر سے یاد آیا کہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے یونانی اور ایلوپیتھی کا تقابل کرتے ہوئے اپنی کتاب میں یونانی طب کے پیچھے رہ جانے اور نسبتاً غیر مقبول ہونے کا سبب یوں بیان کیا ہے۔

'بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں تک بھی حیدرآباد میں یونانی طرز علاج ہی کو فوقیت حاصل تھی۔ ایلوپیتھی طرز علاج کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ اس زمانے میں امراض کی تشخیص کے لیے عصری آلات سے لیس لیباریٹریز بھی نہیں تھیں۔۔۔ لیکن ایلوپیتھی طرز علاج میں ترقی تیز رفتاری سے ہوئی اور جیسے جیسے مرض اور اس کی وجوہات دریافت ہونے لگیں اس کی دوائیں بھی عام ہوتی گئیں۔'

یعنی وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ یونانی اطبّا میں تحقیق اور جستجو نہ ہونے سے یونانی طب پیچھے رہ گئی۔ دوسری وجہ یہ بھی بنی ہوگی کہ عمل جراحت (سرجری) میں بہت پیش رفت ہوئی۔ اس سے زیادہ، اس موضوع پر تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی بھی ڈاکٹر مجید خان کی طرح اس فکر اور سوچ کے حامل تھے کہ اردو داں عوام کی صحت و طبّی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ماہرین کو توجہ کرنی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے عمومی اور خصوصی امراض اور ادویہ کے اثرات پر مضامین لکھے جو روزنامہ سیاست میں اہتمام سے

شایع ہوتے تھے۔ ان مضامین کو پسند کیا گیا اور قارئین استفسارات بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے لکھے گئے 64 مضامین کی کتابی شکل میں پہلے حصّہ کے طور پر سنہ 2010ء میں 'انسانی امراض اور طبّ جدید' کے عنوان سے اشاعت عمل میں آئی۔

'ان طبیبوں کے نام جنھوں نے طب کے مقدس پیشہ کو خدمت خلق جانا، اسے تجارت نہیں بنایا' ایسا ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے اپنے مضامین کے مجموعے کے انتساب میں لکھا ہے۔ یہ انتساب اور اُس دور کے چند ڈاکٹرس کے بارے میں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس دور یعنی ایک صدی قبل پیدا ہونے والے ڈاکٹروں جیسے ڈاکٹر عبدالمنان، ڈاکٹر آر آر سکسینہ، ڈاکٹر بنکٹ چندر، ڈاکٹر بہادر خان وغیرہ ڈاکٹری پیشہ کو خدمت خلق کا درجہ دیتے اور اپنی خدمت کے واجبی سے کم دام لیا کرتے تھے لیکن جب سے علم اور پیشہ طب نے ایک صنعت کا درجہ پایا ہے علاج معالجہ تجارت بن گئی ہے۔ آج کے دور میں یہ انتساب اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی اپنی کتاب کے پیش گفتار میں لکھنے کی وجہ کے بارے لکھتے ہیں کہ 'آ گہی کے اس دور میں خود میں بھی ایک مسافر ہوں لیکن اپنے ضعف اور ناتوانی کے باوجود میرا ذوق سفر مجھے اس راہ میں گامزن کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ ان طبّی جرائد میں جو تحقیقات اور عمومی مفاد میں جو مواد حاصل ہوتا رہتا ہے، اس کے علاوہ جو چیزیں میرے طویل تجربہ میں شامل رہی ہیں، اسے میں نے اخبار سیاست کے توسط سے ہدیہ قارئین کرتا رہا ہوں۔ ان مضامین میں عمومی اور خصوصی امراض پر بھی مضامین شامل ہیں اور ادویہ کے اثرات پر بھی۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں اردو داں طبقے کی ان مضامین کے ذریعہ کچھ خدمت کر سکا'

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے مضامین عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو داں طبقے کے لیے بنیادی معلومات پر مبنی عام فہم اور آسان زبان میں طبّی مضامین لکھے جاتے ہیں۔ مضامین کو مشکل اصطلاحات، معلومات اور جدید تحقیق سے دور رکھا جاتا ہے۔ اول تو جدید معلومات اور تحقیق کو اردو زبان میں پیش کرنا دقت طلب کام ہوتا ہے کہ ہر لکھنے والا اردو زبان کا ماہر نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ ہے کہ اردو داں طبقہ ثقیل موضوعات کو اکثر و بیشتر پسند نہیں کرتا، اردو والوں کو ہلکے پھلکے

موضوعات جیسے سیاست، ادب اور شعر و شاعری چاہیے ہوتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کا کمال تھا کہ وہ معیاری زبان میں مختصر مضامین تحریر کرتے جن میں کسی موضوع سے متعلق جدید تحقیق اور ریسرچ پر بات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے مضامین پڑھنے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں (اردو والوں) جدید طب میں ہونے والی ترقی سے باخبر رکھنا چاہتے ہیں، اسی لیے تو کتاب کا عنوان 'انسانی امراض اور جدید طب' رکھا ہے۔

ڈاکٹر مجید خان کے مطابق ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے میں لطف آتا تھا۔ بات سولہ آنے صحیح ہے، مجھے بھی اس کام میں ادبی معمہ حل کرنے جیسا مزا آتا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کو انگریزی اصطلاحات کے اردو متبادل بنانے میں معرکہ حاصل تھا۔ کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی بنائی چند اصطلاحات کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

Severe Acute Respiratory Syndrome (مخفف SARS) کے لیے ڈاکٹر صاحب نے 'شدید تنفّسی عارضہ' لکھا ہے۔ Chronic Obstructive Pulmonary Disease (مخفف COPD) کا اردو متبادل ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے 'شش میں ہوا کی روانی میں جزوی رکاوٹ کا کہنہ عارضہ' بتایا ہے۔ Benign Prostate Hyperplasia (مخفف BPH) کو ڈاکٹر صاحب نے 'غدہ مثانہ کی غیر کینسر بڑھوتری' کہا ہے۔ Gastro Esophageal Reflux Disease (مخفف GERD) کا اردو ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے 'معدہ کی غذا کا الٹا بہاؤ' ترجمہ کیا ہے۔

اسی طرح Antiviral Drugs کو 'وائرس کش ادویات' کا نام دیا ہے۔ Silent Epidemic کو 'خاموش وبا' کہا ہے۔ H. pylori کا نام 'چکردار جرثومہ' رکھا ہے۔ Preventive Measures کو 'انسدادی تدابیر'۔ Bird Flu کو 'پرند فلو' لکھا ہے۔ Intensive Care Unit کو 'شعبہ انتہائی نگہداشت' بتایا ہے۔ Gall Stones کا اردو متبادل 'پت پتھریاں' بنایا ہے۔

غرض، کتاب میں اس قسم کی بیسوں مثالیں مل جاتی ہیں۔ جدید امراض کے اردو متبادل

وضع کرنے اور جدید طبّی معلومات کو پیش کرنے میں ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے مضامین طبّی موضوعات پر لکھنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اس لیے میری رائے ہے کہ طبّی موضوعات پر لکھنے والوں کو بالخصوص ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ادارۂ روزنامہ سیاست کی جانب سے شائع کردہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے مضامین کے پہلے حصّہ میں 'گفتگو' کے عنوان سے سیاست اخبار کے ایڈیٹر جناب زاہد علی خان نے لکھا ہے کہ اس کا دوسرا حصّہ بہت جلد قارئین کی نذر کیا جائے گا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ آیا ڈاکٹر صاحب کے بصیرت افروز مضامین کا دوسرا حصّہ بھی شائع ہوا ہے۔ اگر شائع ہوا ہے تو ادارۂ سیاست قابل مبارکباد ہے اور اگر شائع نہیں ہوا ہے تو میری درخواست ہے کہ یہ کام جلد سے جلد انجام دیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کی طبیعت اور فطرت کے بارے میں ڈاکٹر مجید نے تعزیتی مضمون میں انھیں ایک فطری مسلمان قرار دیا ہے اور اسی کو اس تعزیتی مضمون کا عنوان 'ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، فطری مسلمان' بھی بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

'ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نہ صرف اچھے معالج تھے بلکہ ایک شفیق استاد بھی، انتہائی نفاست پسند، خوش پوشاکی کے دلدادہ، خوش مزاج اور بہت ہی ناپ تول کر کوئی مزاحیہ بات کرتے تھے۔ ان کے مزاح میں بھی بہت وزن تھا اور اس کی معنویت اور اہمیت پر زور دینے کے لیے اکثر اس کو دہراتے تھے۔ یہ ان کے لطیف مزاح کی خصوصیت تھی۔۔۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی راست باز اور سیدھے سادے انسان تھے۔۔۔ اصول پسندی کوٹ کوٹ کر ان کی شخصیت میں رچی بسی تھی۔'

ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کی سخت گیر اصول پسندی کا ذکر مجتبیٰ حسین نے بھی اپنے ایک کالم میں کیا ہے۔ 'بیشتر مریض تو ڈاکٹر ابوالحسن کے ہاں جانے کے خیال سے ہی گھبرا کر خود بخود صحت یاب ہو جاتے تھے۔'

بہتر ے خوبیوں کے حامل اور اردو میں عصری طبّی مضامین تحریر کرنے والے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کا تقریباً نوے برس کی عمر میں 12 جولائی 2014ء کو منی سوٹا، امریکہ میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر مجید خان

ڈاکٹر محمد عبدالمجید خان جنھیں ڈاکٹر ایم اے ایم خان یا ڈاکٹر مجید خان بھی کہا جاتا ہے سے میری ملاقاتیں اس وقت سے تھیں جب میں ہاوز سرجن شپ (سنہ 81-1980ء) کر رہا تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر مجید خان حیدرآباد شہر میں ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اور اردو حلقوں میں سماجی، صحت عامہ اور صحت مند نفسیات کے فروغ کے مختلف پروگراموں میں حصّہ بھی لینے لگے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی کہ ڈاکٹر مجید خان نے شہر میں پہلا خانگی نفسیاتی دواخانہ 'سٹی نرسنگ ہوم' قائم کیا ہے۔

ہم جونئیر ڈاکٹرس نے سنئیر ڈاکٹرس کے تعاون سے ایک گروپ تشکیل دیا تھا جس کا مقصد پوسٹ گریجویشن میڈیکل انٹرنس میں مسلم ڈاکٹرس کے داخلوں کو بہتر بنانا تھا۔ آگے چل کر یہ گروپ مسلم ایجوکیشنل، سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (میسکو، MESCO) کی شکل اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر مجید خان میسکو کے اعزازی سکریٹری بنائے گئے تھے۔ میسکو نے اس وقت یوں تو کئی فلاحی کام انجام دیے لیکن ڈاکٹر مجید خان کی نگرانی میں پرانے شہر کے اردو داں عوام کے لیے 'عوامی لیکچرس' کا انعقاد بہت مقبول پروگرام تھا۔ شاید دس پندرہ برسوں تک لیکچرس کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان لیکچرس میں لوگوں کی کثیر تعداد شریک ہوتی اور ماہرین سے سوالات بھی کیے جاتے تھے۔ ان محافل میں عام لوگوں کو سماج کے مختلف شعبوں کے ماہرین سے ملنے کا موقع بھی ملتا تھا۔

سعودی عرب میں ملازمت ملنے پر میں ریاض شہر کوچ کر گیا۔ اس دوران اخبار ’سیاست‘ میں اتوار کے ہفتہ وار ایڈیشن میں ڈاکٹر مجید خان کا صحت، نفسیات، سماج اور سیاست پر مضمون یا کالم شائع ہونے لگا۔ یوں میں باہر رہتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاحب کے رابطہ میں رہا۔ ہر ہفتہ انھیں پڑھنے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ڈاکٹر مجید خان کی تحریروں کو پڑھنے اور پسند کرنے والوں میں میرے علاوہ اور دوسرے غیر مقیم ہندوستانی بھی تھے۔ چھٹی پر آتا تو اردو کی محفلوں میں ڈاکٹر مجید خان سے ملاقات ہوتی یا میں ان سے ملنے ان کی کلینک یا گھر چلا جاتا تھا۔

سعودی عرب سے واپسی کے بعد سنہ 2010ء سے میں اردو میں سائنسی اور معلوماتی ادب کو فروغ دینے کی کوششوں میں مصروف ہوگیا اور شہر میں اردو میں سائنس لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا ارادہ کیا۔ نامور سائنسی ادیب اور مدیر جناب یوسف مڑکی سے مشورہ کیا اور ہم نے ایک انجمن ’سلطان العلوم سائنٹیفک سوسائٹی‘ بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس ضمن میں سوسائٹی کی سرپرستی کی درخواست لے کر ہم ڈاکٹر مجید خان کے گھر پہنچے۔ مقررہ وقت پر ملاقات ہوئی۔ وہ خوش ہوئے اور ہم نے ان سے سوسائٹی کے صدر بننے کی خواہش کی۔ وہ تیار بھی ہو گئے تھے لیکن ہماری دیگر مصروفیات کے سبب یہ سوسائٹی تشکیل نہ پاسکی اور اب نہ ڈاکٹر مجید خان ہیں اور نہ ہی یوسف مڑکی صاحب!

ڈاکٹر مجید خان کی پیدائش نظام آباد کے ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد محمد عبدالحمید محکمۂ ریلوے میں ملازم تھے۔ بچپن میں آپ کا خاندان حیدرآباد منتقل ہوا اور آپ نے چادرگھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ پھر آپ کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا جہاں سے سنہ 1959ء میں ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر مجید خان نے ایسے وقت میں تعلیم پائی تھی جب شہر حیدرآباد میں اردو زبان بحیثیت ذریعہ تعلیم ختم ہو رہی تھی اور جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم انگریزی کر دیا گیا تھا۔ اس لیے آپ کی ابتدائی اور اسکولی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ہوئی جبکہ آپ نے ایم بی بی ایس کی سند انگریزی زبان کے ذریعہ حاصل کی۔

عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر مجید خان نے

دو ایک برسوں کے لیے ضلع نظام آباد کے سرکاری دواخانوں میں کام کیا اور سنہ 1961ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ روانہ ہوئے۔ برطانیہ سے ایم آر سی سائک (MRCPsych) ڈپلومہ لے کر سنہ 1966ء میں حیدرآباد واپس ہوئے اور عثمانیہ جنرل ہاسپٹل میں ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے نفسیات کا شعبہ سنبھالا لیکن زیادہ دیر اس عہدہ پر برقرار نہ رہے۔

ڈاکٹر مجید خان نے سنہ 1970ء میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر خانگی پریکٹس شروع کی اور اپنا ایک تیس بستر والا خانگی دواخانہ 'سٹی نرسنگ ہوم' کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر مجید خان نے ایک مشکل طبّی اختصاص (اسپیشالیٹی) نفسیات یعنی سائیکاٹری (Psychiatry) کا انتخاب کیا تھا۔ ہم اسے ان کا شوق اور نفسیات سے ان کی دلچسپی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اس طبّی اختصاص کی شہرت ہے اور نہ ہی یہ آسان ہے۔ نفسیاتی اور دماغی امراض کو عام جسمانی امراض کی طرح نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان امراض کو ایک عیب، بدنامی اور ناقابل علاج مانا جاتا ہے۔ مزید آفت یہ کہ علاج کے لیے عملیات، جھاڑ پھونک اور جادو ٹونے کا سہارا تک لیا جاتا ہے۔ نافہم طریقۂ علاج سے مریض اور خاندان دونوں کو مالی، جسمانی، سماجی اور معاشرتی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسے حالات میں مریضوں اور ان کے رشتہ داروں کو صحیح معلومات پہنچانا اور انھیں علاج کے لیے راغب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آج سے نصف صدی قبل جب ڈاکٹر مجید خان نے نفسیاتی اور دماغی امراض کی خانگی پریکٹس اور دواخانہ شروع کیا تھا، اس وقت حالات اور زیادہ دگرگوں تھے۔ ایسے ماحول میں ڈاکٹر مجید خان نے کام شروع کیا اور بحیثیت ایک ماہر نفسیات اور نفسیاتی معالج کامیاب رہے اور آپ کا قائم کردہ سٹی نرسنگ ہوم اب شہر میں سب سے قدیم خانگی نفسیاتی دواخانے کا اعزاز رکھتا ہے۔ ڈاکٹر مجید خان کے انتقال کے بعد یہ نرسنگ ہوم آپ کی بیگم ڈاکٹر ڈی خان کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

ڈاکٹر مجید خان نے برطانیہ میں قیام کے دوران محسوس کر لیا تھا کہ ہمارے سماج میں نفسیات سے متعلق معلومات کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہے۔ اپنی کتاب 'جدید نفسیات' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔ 'انگلستان میں نفسیاتی امراض کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ

عصری نفسیاتی معلومات کی تشہیر کی ضرورت ہندوستان میں زیادہ ہے۔ بس اسی جذبے کے تحت انگلستان میں مستقل سکونت کا ارادہ ترک کرکے حیدرآباد واپس آ گیا۔ روز اول ہی سے میں اس مہم میں جٹ گیا۔ عوام سے مخاطبت کے کسی موقع کو میں نے نہیں گنوایا۔ عوامی جلسوں میں تقاریر، اخبارات میں انٹرویوز، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر مباحث میں حصّہ لیتے ہوئے میں نے عوام کے ذہنوں سے یہ دقیانوسی وہم دور کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے کہ دماغی امراض کا علاج صرف پاگل خانوں میں یا عاملوں کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ دماغی امراض بھی جسم کے دوسرے امراض کی طرح علاج کے محتاج ہیں۔'

اعلیٰ تعلیم کے لیے یوں تو ہمارے ملک سے ہر سال کئی ڈاکٹرس اور دوسرے ماہرین یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اور پھر وہاں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ وہاں کی منظّم اور آرام دہ زندگی چھوڑ کر اپنوں کے دکھ، درد، محرومیوں اور ناتمامیوں میں ساتھ رہنے وطن واپس آتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مجید خان بھی تھے جنھوں نے ایک مثال چھوڑی ہے۔ یہ مثال نہ صرف قابل ستائش بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

ڈاکٹر مجید خان پیشہ وروں بالخصوص ڈاکٹروں کی مستقل تعلیم اور تربیت کی اہمیت کے معترف تھے۔ اس لیے وہ نہ صرف خود کو نئی معلومات اور تجربات سے ہم آہنگ رکھتے تھے بلکہ اپنے جونئیرس کے لیے لیکچرس اور کانفرنسوں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ڈگری کے حصول کے بعد مستقل تعلیم کے حصول کو سی ایم ای (CME - Continuous Medical Education) کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مجید خان ہر سال بیرون ملک تعلیمی دوروں پر جایا کرتے تھے۔ سنہ 1976ء میں انھوں نے آسٹریلین اور نیوزی لینڈ رائل کالج آف سائیکاٹرسٹس سے ممبرشپ کا امتحان پاس کیا اور چند سالوں بعد اسی کالج سے ان کو فیلوشپ عطا کی گئی۔ اس سے قبل انھیں برطانیہ کے رائل کالج آف سائیکاٹرسٹس سے فیلوشپ عطا کی جا چکی تھی۔

ڈاکٹر مجید خان دکن میڈیکل کالج کے شعبہ نفسیات (سائیکاٹری) کے بانی پروفیسر تھے اور چند برسوں بعد وہ اس کالج میں اعزازی پروفیسر (Prof. Emiritus) مقرر کئے گئے تھے۔ طبّی

تعلیم کی بابت ڈاکٹر مجید خان شاکی تھے کہ نفسیات یعنی سائیکاٹری کو ایم بی بی ایس کے نصاب میں جتنی اہمیت دی جانی چاہیے اتنی نہیں دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں طالب علموں کو یہ مضمون پڑھایا تو جاتا ہے لیکن کوئی امتحان نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر مجید خان کا ماننا تھا کہ زندگی میں نفسیات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے کردار، رویّوں اور عادتوں وغیرہ کا انحصار نفسیات پر ہی ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بھی ہمیں صحت مند رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسمانی طور پر تن درست رہنا ہے۔ اس لیے نفسیات کے موضوع کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف موقعوں پر ڈاکٹر مجید خان لیکچرس دیا کرتے تھے جن میں طلبا، ماہرین اور عوام کی کثیر تعداد موجود رہتی تھی۔

ڈاکٹر مجید خان ایک بہادر اور حقیقت پسند انسان تھے اور موت کے برحق ہونے کا انھیں اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ زندگی میں کسی وقت سانس لیتے ہوں۔ وہ عام ڈاکٹروں سے مختلف تھے جو موت سے ہارنے والی لڑائی آخر وقت تک لڑنے میں اپنی توانائی اور مریضوں کا پیسہ برباد کرتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے معالج سے کہہ رکھا تھا کہ اللہ کے پاس سے بلاوا آنے پر انھیں آئی سی یو میں رکھ کر موت کی راہ میں عارضی رکاوٹ ڈالنے کی بجائے سکون سے اپنے رب سے ملنے کے لیے روانہ ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ چناں چہ جب ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بگڑی تو ان کے معالج نے آئی سی یو میں لے جانے سے منع کر دیا اور ان کا انتقال گھر پر اپنے خاندان اور چاہنے والوں کے درمیان 10 مئی 2015ء کو 81 سال کی عمر میں ہوا۔

ڈاکٹر ضیاء ندیم ایم بی بی ایس، ایم فل، ایف آر سی سائیک (برطانیہ) نے ڈاکٹر مجید خان کے انتقال پر اردو اور انگریزی زبانوں میں تعزیتی مضامین تحریر کیے ہیں۔ اردو زبان میں لکھا ہوا مضمون ڈاکٹر ضیاء نے روزنامہ 'منصف' میں اپنے کالم کے لیے لکھا اور شائع کیا ہے جب کہ انگریزی زبان میں Obituary عنوان کے تحت Telangana Journal of Psychiatry کے شمارہ 2015:1(1);63-65 میں چھپا ہے۔ ڈاکٹر مجید خان رشتہ میں ڈاکٹر ضیاء ندیم کے حقیقی ماموں ہوتے ہیں اور وہ ان سے بے انتہا متاثر بھی ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء ندیم نے اپنے 'رول ماڈل' کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف ایم بی بی ایس کیا بلکہ ماموں کی وہی اسپیشالیٹی کو اپنایا اور برطانیہ بھی گئے۔ وہاں رائل کالج آف سائیکاٹرسٹس سے ڈپلومہ حاصل کر کے واپس ہوئے۔ حیدرآباد میں خانگی پریکٹس کو فوقیت دی اور اپنا خانگی دواخانہ بھی قائم کیا۔ حدتو یہ ہے کہ اپنے ماموں کی دیکھا دیکھی شہر کے ایک دوسرے روزنامہ 'منصف' میں نفسیات پر اردو زبان میں کالم لکھنے لگے۔ ڈاکٹر ضیاء ندیم لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایسا اپنی ماں کی خوشنودی کی خاطر کیا تھا کہ ان کے چہیتے بھائی کے نقش قدم پر چل کر ماموں جیسا بن جاؤں۔ میرے خیال میں کسی سے افرادِ خاندان خوش ہوں اور آنے والی نسل کے لیے وہ رول ماڈل بنے، یہ انسانی زندگی کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء ندیم نے یوں تو اپنے مضمون میں ڈاکٹر مجید خان کے متعلق کئی اچھی باتیں لکھی ہیں، جس سے یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ 'ڈاکٹر مجید خان نے اصل معنوں میں حیدرآباد میں نفسیات کو متعارف کروایا۔ ایک ایسے وقت جب لوگ اس کے بارے میں جانتے بھی نہیں تھے، ڈاکٹر صاحب نے نفسیاتی علاج کی ابتدا شہر میں کی اور یہاں کے نفسیاتی مریضوں کو جینے کی ایک راہ بتادی اور زندہ رہنے کی وجہ دے دی۔ ان کے رشتہ داروں کو سکون پہنچایا۔ اس لیے بعض لوگ انھیں یہاں کے بابائے نفسیات کہتے ہیں۔'

اردو زبان کے حوالے سے بات کی جائے تو ڈاکٹر مجید خان نے ایسا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے جس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی یا مشکل سے ملتی ہے۔ آپ نے عام فہم انداز میں اردو داں عوام کے لیے سائنسی معلومات اور اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی مضامین لکھے جو ہر اتوار روزنامہ 'سیاست' میں شائع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر مجید خان کی ان تحریروں کو ہم چاہیں تو نفسیات، سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا کالم بھی کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مجید خان سلسلہ وار مضامین یا کالم، تین دہوں سے زیادہ عرصہ تک لکھتے رہے، آخری مضمون یا کالم ان کے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے شائع ہوا تھا۔ تین دہوں کا حساب بھی کیا جائے تو انھوں نے دیڑھ ہزار سے زائد مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔

مستقل لکھتے رہنے کے اسباب یا ہر ہفتہ لکھنے کی تحریک کے بارے میں ڈاکٹر مجید خان نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ 'کسی بھی مضمون لکھنے کی جو مجھ میں تحریک ہوتی ہے چاہے وہ نفسیاتی موضوع پر ہو یا سماجی یا سیاسی وہ سنجیدہ اور گہرے غور وفکر کے اضطراب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ غالباً میں بہت حساس انسان ہوں۔ مسلسل مقامی، قومی اور بین الاقوامی حالات پر کڑی نظر رکھتا ہوں اور ان پر ان کی اہمیت کے مطابق تبصرے کرتا ہوں۔ خاص طور پر وہ حالات جن کا راست اثر ہم پر پڑتا ہے اور ہم قدم نہ سہی قلم تو اٹھا سکتے ہیں۔'

ڈاکٹر مجید خان کے مضامین کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لوگوں کی نفسیاتی تعلیم و تربیت کرنے اور ان کے مسائل کا حل دریافت کرنے میں مدد کے لیے لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مجید خان زیادہ الفاظ، غیر ضروری باتیں اور طویل جملے نہیں لکھتے تھے۔ اندازِ بیان بہت سادہ اور عام فہم ہوتا تھا اور عام اور آسان زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں حیدرآبادیت جھلکتی ہے۔ اپنی تحریروں میں اشعار کا بھی وہ سہارا لیا کرتے تھے۔ مختصراً ان کی طرز تحریر کو اس شعر میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

اندازِ بیاں گر چہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں، مری بات

ان کا مقصد ادب عالیہ تخلیق کرنا نہیں تھا بلکہ اردو زبان کے ذریعہ لوگوں کے مسائل حل کرنا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مجید خان کی تحریروں میں ادب اور کلاسیکیت تلاش کرنے والوں کو ناامیدی ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں معلومات اور کام کی باتیں ہوتی ہیں اور یہی فرق روایتی ادب اور معلوماتی ادب میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مجید خان نے معلوماتی ادب تخلیق کیا ہے جو عوام الناس کے کام آتا ہے اور جسے 'کارآمد ادب' بھی کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مجید خان کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین کو اکثر مریضوں کی روداد یا خبروں کے واقعات سے شروع کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مضامین دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ مضامین میں لوگوں کو درپیش مسائل، ممکنہ حل اور ہدایات بھی دی جاتی تھیں جس سے مضامین کی

افادیت میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مجید خان کو اپنے مضامین یا کالموں کے عنوانات لگانے میں ملکہ حاصل تھا۔ مضامین کے لیے بڑے دلچسپ اور جاذب نظر عنوانات لگاتے تھے جس سے قاری ان مضامین کی طرف متوجہ ہوتا اور اس میں پڑھنے کا تجسّس بھی پیدا ہوتا ہے۔ سینکڑوں عنوانات میں سے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔ اسیر توہمات، دیوانی عجلت، میاں مکمل، میاں نامکمل، پگلی عاشقی مگر سمجھ دار شادی، بھوت پریت کا سوداگر، عصری پاگل، تقلیدی نمونے، فالتو اشیا جمع کرنے کی عادت، الٹی کھوپڑی، آنسو کے سبق، اناہ کی پناہ، ضعیفی میں مزاح، ایک کشتی ہزار طوفان، پالتو داماد، بے جوڑ جوڑے، معتبری کی نفسیات، جنسیاتی نفسیات یا نفسیاتی جنسیات، وغیرہ۔

بعض مضامین کے عنوانات ڈاکٹر مجید خان نے مشہور اور زبان زد عام مصرعے جیسے کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک، کب تک میرے مولا، مبادا نہ ہو جائے نفرت زیادہ، لگائے تو چند مضامین اور کالموں کے عنوانات کو فلمی مکھڑوں سے بھی آراستہ کیا۔ ایسے چند عنوانات جو یاد رہ گئے ہیں پیش ہیں کہ وقت نے کیا کیا حسیں ستم، ہم آپ کی آنکھوں سے، زندگی کی راہ میں چل اور کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو، وغیرہ۔

ڈاکٹر مجید خان کی تحریروں کو عوامی مقبولیت حاصل تھی اور آج بھی ہے۔ لوگ ان کے مضامین بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے بلکہ اتوار کا انتظار رہتا تھا کہ دیکھیں اس ہفتہ ڈاکٹر صاحب کس موضوع پر لکھتے ہیں۔ روزمرّہ کی زندگی میں بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا کہ جب کسی کا برتاؤ عجیب و غریب اور تکلیف دہ ہوتا تو لوگوں میں سے کوئی اسے ڈاکٹر مجید خان سے رجوع ہونے کا مشورہ دیتا تھا۔

ڈاکٹر مجید خان کی تحریروں کی عوامی مقبولیت کا اندازہ آج یعنی ان کے انتقال کے چھ برسوں بعد بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں 6 اپریل 2021ء کے منصف اخبار میں 'ایڈیٹر کے نام' میں ایک خط چھپا ہے جس میں ڈاکٹر مجید خان کو یاد کیا گیا ہے۔ یہ خط امارات سے ابوفہد نے لکھا ہے، خط کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ 'بات کچھ پرانی ہے۔ یہی کوئی دس بارہ سال قبل ان دنوں

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر مجید خان ایک موخر اخبار کے ہفتہ وار سپلیمنٹ میں پابندی سے اپنے پیشہ سے متعلق واقعات اور تجربات آسان اردو میں لکھتے تھے۔ لکھنے کا انداز دلچسپ اور معلوماتی ہوتا جس کی وجہ سے نفسیات جیسے خشک موضوع پر ان کے مضامین قارئین بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ایک اسی طرح کے مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا تھا وہی دراصل میرے اس خط لکھنے کا محرک بنا ہے۔۔۔'

عوام میں حد درجہ مقبول تحریروں کو خواص کے درمیان پذیرائی کا فقدان نظر آتا ہے۔ ابھی تک شاید ان کے مضامین اور کالموں پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر لکھا گیا ہے تو میری نظر نہیں گزرا ہے۔ تحقیقی کام کے علاوہ ڈاکٹر مجید خان کے مضامین کو کالج اور یونیورسٹی کے نصابی کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر مجید خان کی کتابوں کے ناشر نے کتاب 'جدید نفسیات' کے عرض ناشر میں اس جانب توجہ دلائی ہے کہ 'یونی ورسٹیز اور کالج کے نصاب میں ان مضامین کو شامل کیا جاسکتا ہے تا کہ نوجوان نسل نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے قابل ہوسکے۔'

اخبار سیاست میں شائع شدہ مضامین کا انتخاب تین کتابوں کی شکل میں ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ 'جدید نفسیات' چارسو صفحات پر مبنی ضخیم کتاب جون 2010ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مہاتما گاندھی جی کے پوتے پروفیسر رام چندر گاندھی جو حیدرآباد سنٹرل یونی ورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور جن سے ڈاکٹر مجید خان کے قریبی تعلقات تھے، ان کی رائے شامل ہے۔ پروفیسر رام چندر گاندھی کتاب کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'یہ کتاب ڈاکٹر محمد عبدالمجید خان ماہر امراض نفسیات کے مضامین کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ان کی اور ان کے زمانے کی سوانح حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرکیاتی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مریضوں کے ساتھ ساتھ ان کے اہل وعیال کی بدلتی اور بگڑتی شخصیتوں کا فنی جائزہ لیتے ہوئے ان کے نفسیاتی بحران کی کیفیت اور ان سے نمٹنے کی تدبیروں کے باریک پہلوؤں کو آسان طریقوں سے سمجھاتے ہیں۔'

'فکر انگیز نفسیات' ڈاکٹر مجید خان کی دوسری کتاب ہے جو ستمبر 2013ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب میں شامل چالیس سے زائد مضامین کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے آج کل کے پیچیدہ معاشرے کے نت نئے انفرادی، خاندانی اور سماجی مسائل پر حقیقی واقعات بیان کرتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔

سنہ 2013ء ہی میں ڈاکٹر صاحب کی تیسری کتاب 'شخصیت کی پہچان اور اس کی مطلوبہ عصری سجاوٹ' بھی شائع ہوئی۔ دوسو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شخصیت کی پہچان اور شخصیت سازی کے موضوع پر مختلف مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ مرض مرگی پر ڈاکٹر صاحب کا اردو زبان میں تحریر کردہ ایک کتابچہ 'دوروں کے امراض، مرگی اور مرگی نما دورے' بھی شائع ہوا ہے۔

اردو زبان میں تین کتابوں اور ایک کتابچہ کے علاوہ ڈاکٹر مجید خان نے انگریزی زبان میں بھی جنھیں اردو نہیں آتی اور انگریزی داں طبقہ کے لیے چند کتابیں اور کتابچے تحریر کیے ہیں۔ دو ایک کتابوں کا ترجمہ تلگو زبان میں ہوا ہے۔ غرض علاج معالجہ کے ذریعہ مریضوں کی خدمت کے علاوہ مضامین، کالموں اور انٹرویوز کی شکل میں عوام بالخصوص اردو داں عوام کو سائنسی اور جدید معلومات (نفسیات) سے بہرور کرنے کی کوششوں کے لیے تاریخ میں ڈاکٹر مجید خان کو یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر ماجد قاضی

ڈاکٹر ماجد قاضی سے میری شناسائی اس وقت سے ہے جب میں اپریل 1989ء میں سعودی عرب کے ریاض شہر پہنچا تھا۔ سعودی عرب میں جن ہندوستانیوں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا ان میں ڈاکٹر ماجد قاضی کا نام سرِ فہرست تھا اور ان کا نام سب سے اوپر کیوں نہیں رہتا، وہ وزیر کے رتبہ کے ڈاکٹر، حکومت کے مشیر اور بادشاہ کے شخصی معالج تھے۔ ان سے ملنا اس لیے مشکل تھا کہ وہ بہت مصروف رہتے تھے اور ان کا حسّاس عہدہ بھی تھا لیکن انھیں اردو زبان وادب سے والہانہ لگاؤ ہونے کی بنا پر میری ان سے ملاقات ممکن ہوئی۔

ڈاکٹر ماجد قاضی کے بڑے بھائی اور اورنگ آباد کے نامور شاعر قاضی سلیم جب کبھی ریاض، سعودی عرب آتے تو ڈاکٹر ماجد قاضی سے ملاقات کی امید پیدا ہوتی تھی۔ قاضی سلیم کی آمد پر ان کے اعزاز میں ریاض شہر کے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ محفلیں منعقد ہوتیں اور دو ایک مرتبہ خود ڈاکٹر ماجد قاضی کے گھر بھی ہمیں مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ اردو زبان وادب سے محبت ہی تھی کہ سعودی عرب میں ایک وزیر کے گھر مشاعرہ ہوتا جس میں ڈاکٹر صاحب خود بھی موجود رہتے تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی نہ صرف ہمارا استقبال کرتے بلکہ ہماری میزبانی بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کے گھر کی ایک ایسی ادبی محفل میں ان سے میرا تعارف ہوا تھا۔

ہم پیشہ اور ہم دونوں ہی کی کمزوری اور دکھتی رگ اردو کے سبب میں بہت جلد ڈاکٹر ماجد

قاضی کے دائرہ شفقت میں آ گیا اور وہ میری نظروں میں مزید محترم ہو گئے۔ اس دوران ہم (چند غیر مقیم ہندوستانی) نے ریاض میں اردو زبان کے فروغ کے لیے 'ہندوستانی بزمِ اردو' قائم کر لی تھی۔ ہم اس بزم کے پروگراموں میں ڈاکٹر ماجد قاضی کو مدعو کرنے لگے۔

ڈاکٹر ماجد قاضی مصروف نہ ہوتے تو ہمارے پروگراموں میں ضرور شرکت کرتے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی انٹرنیشنل انڈین اسکول ریاض میں منعقدہ تقریری مقابلوں میں کبھی صدر رہے تو کبھی مہمان خصوصی بن کر تشریف لائے تھے۔ 'محبّ اردو ایوارڈ' ان کے ہاتھوں دیے گئے۔ مشاعروں میں ڈاکٹر ماجد قاضی مہمان خصوصی یا مہمانِ اعزازی ہوتے تھے۔ سفارت خانہ ہند کی دعوت پر آنے والے مہمان شاعروں، ادیبوں اور معززین کے استقبالیہ پروگراموں میں وہ رونق افروز ہوتے تھے۔ کئی پروگرام ہم نے سفارت خانے کی سرپرستی میں منعقد کیے جس میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی ہمارے لیے باعث افتخار ہوتی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ریاض، سعودی عرب میں اردو کی ترقی و ترویج کی کوششوں میں ہمیں ڈاکٹر ماجد قاضی کی سرپرستی اور عملی تعاون حاصل رہا ہے۔ ان کی موجودگی دوسرے معززین کی آمد کا سبب بنتی اور وہ بڑی اچھی اور دلچسپ تقریر بھی فرماتے تھے۔

اگست 2005ء میں شاہ فہد بن عبدلعزیز کے انتقال کے بعد ڈاکٹر ماجد قاضی کی پیشہ ورانہ اور سرکاری ذمّہ داریوں میں کمی ہوئی اور انھیں فرصت میسّر آنے لگی تو ان سے تقریباً ہر ہفتہ ہی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہمیں ڈاکٹر ماجد قاضی کے ساتھ ظہرانہ اور عشائیہ کرنے کا بھی موقع ملنے لگا۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔

طب اور صحت کے موضوع پر میں نے جب اپنی پہلی کتاب 'ذیابیطس کے ساتھ ساتھ' مکمل کر لی تو اس کا مقدمہ لکھنے کے لیے میں نے ڈاکٹر ماجد قاضی سے درخواست کی۔ وہ خوش ہوئے اور کتاب پڑھ کر جامع مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ڈاکٹر ماجد قاضی نے مرض ذیابیطس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

'مرض سکّری، مدھومیہا یا ذیابیطس، خاص طور پر اس کی قسم 2 نے عالمی وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ باقابو ذیابیطس کے ساتھ باخوبی رہا جا سکتا ہے لیکن بے قابو ذیابیطس جینا محال کر سکتا

ہے۔ دل، دماغ، اعصابی ریشے، گردے، آنکھیں، جنسی و حملی نظام، سب کو ہی اپنے مضر گھیرے میں لے سکتا ہے۔ امراض قلب میں مبتلا ہونے کا خدشہ دوگنا چوگنا ہو جاتا ہے۔ فالج کا خدشہ پانچ گنا اور بینائی کھونے کا خطرہ چار گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ زخموں کا بھرنا اور جراثیم سے مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ جناب من پریشانی کی نہیں، جانکاری کی ضرورت ہے اور یہ مرض قابل تسخیر اور قابل قابو ہے۔

امریکہ کا ایک طبی جریدہ New England Journal of Medicine میں عالمی ماہرین طب کی ایک اجتماعی تحقیقی رپورٹ ستمبر 2006 عیسوی میں چھپی تھی۔ گزشتہ بیس سالوں میں مرض قلب وغیرہ سے شرح اموات میں جو کمی ہوئی، وہ مریضوں کے دو گروپوں میں یکساں پائی گئی۔ ایک گروپ کا مہنگا علاج بہت ہی ماڈرن طبی مراکز میں جدید ترین آلات اور اعلیٰ جراحی طریقوں سے ہوا۔ دوسرا گروپ ہزاروں کا وہ تھا جن کے لیے حسب ذیل باتوں پر زور دیا گیا تھا۔ مریضوں کی مرض کے متعلق تعلیم، اصول حفظان صحت پر عمل آوری، احتیاطی منصوبے، تمباکو نوشی پر پابندی، مناسب غذا، موٹاپے کی روک تھام، بلڈ پریشر اور ذہنی تناؤ کا علاج، حرکیاتی زندگی وغیرہ۔ اس گروپ میں علاج کا طریقہ آسان اور سستا تھا، اسی لیے کہتے ہیں کہ الــوقــایــہ احســن مــن العلاج۔' (احتیاط علاج سے بہتر ہے۔)

ڈاکٹر ماجد قاضی کا مقدمہ کا اثر تھا یا مرض کی شہرت 'ذیابیطس کے ساتھ ساتھ' کے تین ایڈیشن شائع ہوئے اور جب میری تیسری کتاب 'کولیسٹرال کم کیجیے' مکمل ہوئی تو میں نے پھر ڈاکٹر صاحب سے اس کتاب کا بھی مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے پھر ایک پرمغز مقدمہ لکھ کر مجھے ممنون کیا۔ اس مقدمہ کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

'مفید کولیسٹرال کی شانداری اور نقصان دہ کولیسٹرال کی قابل گرفت بدکاری سے آگاہ کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کتاب روغنی اور کولیسٹرالی معلومات کا خزانہ ہے جو قارئین کو علم سے مالا مال کر سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد معز انسانی جسم ایک پر پیچ مشین ہے جس کی دیکھ بھال ہم پر واجب ہے تاکہ ہماری یہ اعصابی، ہیکلی اور لہودار جسمانی مشین تا حیات 'چلتی پرزہ' سلیم الجسم اور سلیم الفہم بنی رہے۔'

طبّی کتابوں کے مقدموں سے پہلے میں نے سنہ 2008ء میں جب ماہنامہ شگوفہ 'عابد معز نمبر' شائع کر رہا تھا، اس وقت بھی میں نے اپنے بارے میں ڈاکٹر ماجد قاضی سے لکھنے کی درخواست کی تھی۔ وہ راضی ہوئے اور میرے کالموں کے عنوان 'پھر چھڑی بات' کی مناسبت سے اس خاکہ کا عنوان 'چھڑی بات عابد معز کی۔۔۔' رکھا۔ اس خاکہ کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

'عابد معز کو کون نہیں جانتا۔ یہ ڈاکٹر ہیں، ماہر تغذیہ اور استحالی امراض۔ آسانی کی خاطر میں انھیں دانے دانے کا ماہر کہتا ہوں۔ محکمہ تغذیہ میں کام کرتے اور منسٹری آف ہیلتھ، سعودی عرب سے دانہ پانی پاتے ہیں اور مفت میں اس محکمہ کے مجلّہ کے انگریزی حصّہ کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ اردو کے بھی ڈاکٹر ہیں اس لیے کہ اردو میں لکھتے بہت ہیں۔ ہنستے ہنستے طنز ومزاحیہ مضامین اور کالم اور سوچتے سوچتے طبی مضامین قلمبند کرتے ہیں۔ ہندوستانی بزم اردو ریاض کے روح رواں اور انڈین ڈاکٹرس فورم ریاض کے صدر ہیں۔ اور ایڈیٹر اوورسیز شگوفہ بھی ہیں۔ اور سعودی عرب میں موجود ہندوستانی اسکولوں کی ہائر بورڈ کے ممبر رہ چکے ہیں۔ اور۔ اور۔ مجھ ناچیز کی باتیں پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ یہ کیا چیز ہیں!'

ڈاکٹر ماجد قاضی کے بارے میں ہمیں معلومات سراج وہاب کے انٹرویو سے بھی ملتی ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر ماجد قاضی کو جنوری 2006ء میں 'پرواسی بھارتیہ سمّان' ایوارڈ ملنے پر لیا تھا۔ یہ انٹرویو سعودی عرب کے انگریزی اخبار 'عرب نیوز' اور ہندوستان کے مختلف اخباروں میں بھی شائع ہوا تھا۔ سراج وہاب کا تعلق بھی اورنگ آباد سے ہے جو انگریزی صحافی ہیں اور پچھلے کئی برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر ماجد قاضی کی پیدائش 7 اگست 1938ء کو اورنگ آباد شہر میں ہوئی جو آزادی سے قبل ریاستِ حیدرآباد کا ایک اہم شہر تھا۔ آپ کے والد قاضی حمید الدین اورنگ آباد کے ایک کامیاب اور نامور وکیل اور مسلم رہنما تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کا اصلی یا خاندانی نام قاضی مجید الدین رکھا گیا تھا لیکن جب وہ سعودی عرب آئے تو یہاں رائج اسم ثلاثی طریقہ کے تحت آپ کا نام الجھن کا باعث بننے لگا۔ اسم ثلاثی طریقہ جو عرب دنیا میں رائج ہے میں کسی شخص کے نام کے تین جزو ہوتے ہیں۔

پہلا جزوخود کا نام، دوسرا باپ اور تیسرا جزو دادا کا یا خاندانی نام ہوتا ہے۔ نام کی الجھن سلجھانے کی کوششوں نے ڈاکٹر قاضی مجیدالدین کو ڈاکٹر ماجد قاضی بنادیا۔ تب سے وہ نئے نام سے اور زیادہ مشہور و معروف ہوئے۔

ڈاکٹر ماجد قاضی کو بچپن سے اردو زبان اور شاعری سے شغف تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے خاصے متاثر تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کے بڑے بھائی قاضی سلیم ایک ممتاز ترقی پسند شاعر اور حلقہ اورنگ آباد سے ممبر آف پارلیمنٹ بھی تھے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی اپنے بھائی کا ذکر بہت محبت سے کرتے تھے اور ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا تھا کہ وہ سلیم بھائی کے انداز میں ان کا کلام پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ بچپن میں بھائی کی نقل کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد قاضی نے بھی نظمیں کہی تھیں۔ ان کی چند نظمیں بچوں کے رسالے کھلونا اور پھلواری میں شائع بھی ہوئی تھیں۔ عرصہ ہوا ماہنامہ کھلونا بند ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کی بچوں کی ایک نظم کو مڈل اسکول کے صوبہ جاتی مقابلے میں طلائی تمغہ (گولڈ میڈل)

قطعات - ڈاکٹر ماجد قاضی

1

ادا کیسے میں اب کروں شکر تیرا
میں جتنا کروں گا وہ پورا نہ ہوگا
یہ رحمت ہی رحمت ہے ہم پہ خدایا
عنایت سے تیری بہت کچھ ہے پایا

2

میں بھی چیخوں تم بھی چیخو ہم سب چیخیں
فرش ہلے عرش ہلے زنجیریں ٹوٹیں
وقت کو شاید پاس رہے یاد رہے
میری وفا میری صدا یہ آوازیں

3

مجرم کے چوغے میں شرافت کے تمغے
ناصح کے دامن پہ ذلالت کے دھبّے
بنے کیسے کوئی صالح و ناصح
سبھی آج بندے جھکے و بکے

انعام میں ملا تھا۔اس وقت ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

امریکہ جانے کے بعد سے ڈاکٹر ماجد قاضی اردو سے دور ہوئے لیکن شاعری سے نہیں، وہ انگریزی میں نظمیں لکھنے لگے تھے۔انگریزی نظموں کے مسودہ کی ایک کاپی انھوں نے اپنی دستخط اور مختصر نوٹ کے ساتھ مجھے عنایت کی تھی۔اس مجموعہ کلام نما دستاویز میں بعض انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے اور بعض نظموں کا اردو کے چار یا چھ مصرعوں میں مطلب بیان کیا گیا ہے۔اس مسودہ میں سے ڈاکٹر ماجد قاضی کے کہے ہوئے تین قطعات پیش ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سنہ 1956ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم کے لیے ڈاکٹر ماجد قاضی اپنے 'پیارے شہر' حیدرآباد آئے۔ پیارے شہر حیدرآباد میں کالج کے دور کا لطف انھوں نے خوب اٹھایا۔ 'کالج ڈے' کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے اور خود کا لکھا مزاحیہ ڈرامے میں 'شیر خان' کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ حیدرآباد شہر اور جامعہ عثمانیہ کا ان کی زندگی سنوارنے اور بنانے میں بہت اہم رول رہا ہے۔

عثمانیہ میڈیکل کالج،عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کی سند حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ماجد قاضی دو ایک برسوں کے لیے گاندھی اور عثمانیہ میڈیکل کالجوں میں ملازمت کی اور پھر ملازمت کو خیر باد کہہ کر سنہ 1962ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ روانہ ہوئے۔امریکہ میں امراض قلب میں مہارت حاصل کی اور ایم ڈی اور ایف اے سی سی (فیلو آف امریکن کالج آف کارڈیالوجی) کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر ماجد قاضی بحثیت ماہر امراض قلب سنہ 1969ء میں اپنی بیوی محترمہ کیرول این اور چھ ماہ کے بیٹے کے ساتھ ریاض، سعودی عرب پہنچے۔ ریاض میں آمد کے پانچ سال بعد ڈاکٹر ماجد قاضی کی زندگی کا وہ نہ بھولنے والا دن آیا جب 15 نومبر 1974ء کو سعودی عرب کے وزیر صحت ڈاکٹر عبدالعزیز خویطر کا ایک مکتوب ان کے حوالے کیا گیا۔اس خط میں ڈاکٹر ماجد قاضی کو مملکت میں دل کے امراض کے متعلق شعور بیدار کرنے اور علاج معالجہ کی عصری سہولتیں فراہم کرنے کے لیے شخصی مشیر مقرر کرنے کی خوش خبری دی گئی تھی۔اس وقت ریاض شہر اور اس شہر میں موجود علاج معالجہ کی

سہولتیں آج جیسی نہ تھیں۔ڈاکٹر ماجد قاضی حالات بہتر کرنے کوششوں میں جٹ گئے۔

ڈاکٹر ماجد قاضی کی حسنِ کارکردگی سے متاثر ہوکر آپ کوسعودی شہریت عطا کی گئی اور سنہ 1977ء میں ڈاکٹر ماجد قاضی کوسعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز کا شخصی معالج مقرر کیا گیا اور دس سال بعد جب ولی عہد بادشاہ بنے تو ڈاکٹر ماجد قاضی کو کابینی وزیر کا درجہ دے کر شاہی طبیب مقرر کیا گیا اور ساتھ میں انھیں شاہی کلینکس کا سربراہ بھی بنایا گیا۔شاہ فہد کے انتقال (سنہ 2005ء) کے بعد بھی ڈاکٹر ماجد قاضی چند برسوں تک اسی عہدہ پر فائز رہے اور پھر سبکدوشی اختیار کرلی۔

قیام سعودی عرب کے دوران میری ملاقاتیں ایسے حیدرآبادی یا جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں سے ہوئی ہے جو شاہی افراد خاندان بشمول بادشاہ، شہزادے اور شہزادیوں کے شخصی معالج تھے یا شاہی کلینکس میں کام کرتے تھے اور بعض اب بھی انہیں عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے یا اس کی کچھ اور بھی وجہ ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال سنائی کارڈیالوجسٹ ہیں اور شاہ خالد کے شخصی معالج رہ چکے ہیں۔ڈاکٹر عثمان عبدالقادر کچھ عرصہ کے لیے شاہ فہد کے معالجین میں شامل تھے۔ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر عثمان نے سعودی شہریت لے لی ہے اور جدّہ میں رہتے ہیں۔ڈاکٹر رفعت حسین انصاری شاہ فیصل اور ان کے خاندان کے افراد کے شخصی معالج رہ چکے ہیں اور ایک عرصہ ریاض میں گزار کر حیدرآباد واپس ہو چکے ہیں۔اسی طرح ڈاکٹر محمد عبدالمعید، ماہر امراض اطفال اور ڈاکٹر قمر حسین انصاری، ماہر امراض شش، دونوں بھی شاہی کلینکس سے وابستہ تھے اور اب حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر اظہر یوسف، ڈاکٹر حبیب بوبکر، ڈاکٹر بشیر کے نام یاد آرہے ہیں جو حیدرآبادی اور عثمانین ہونے کے ساتھ شاہی کلینکس میں کام کرتے ہیں۔

ہندوستان کی حکومت نے جنوری 2006ء میں ڈاکٹر ماجد قاضی کو 'پرواسی بھارتیہ سمّان یوارڈ' سے سرفراز کیا تھا۔سفارت ہند سعوی عرب نے اس ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر ماجد قاضی کا انتخاب ہونے، 9 جنوری کو ایوارڈ لینے کے لیے حیدرآباد آنے اور ہندوستان کے سفیر سے ملاقات کرنے کا

پیام پہنچانے کے لیے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ماجد قاضی کو فون کر کے خوش خبری سنائی۔ چند لمحوں کے لیے وہ خاموش رہے، پھر حیرت اور انکسار بھرے لہجہ میں دریافت کیا۔ 'بھائی میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'

میں نے فخر سے جواب دیا۔ 'یہ ہندوستان کی حکومت اور عوام جانتی ہے۔'

ہندوستانی حکومت کی منسٹری آف اوورسیز انڈین آفیرس کی جانب سے ہر سال ہندوستانی نژاد باشندوں کو یہ ایوارڈ دیا جاتا ہے جو دوسرے ممالک میں غیر معمولی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ ایوارڈ صدر جمہوریۂ ہند کے ہاتھوں دیا جاتا ہے۔ اس سال جملہ پندرہ لوگوں کو یہ ایوارڈ دیا گیا تھا جن میں پہلی مرتبہ خلیج سے ڈاکٹر ماجد قاضی کا انتخاب ہوا تھا۔

تفصیلات بتا کر میں نے کہا۔ 'اب آپ حیدرآباد کے دورہ اور ایوارڈ وصول کرنے کی تیاری شروع کر دیں۔' یہاں میں بتلا دوں کہ ڈاکٹر ماجد قاضی نے اپنے وطن اور حیدرآباد سے ناطہ بنائے رکھا ہے اور حیدرآباد شہر کے جوبلی ہلز میں اپنا ذاتی مکان بنا رکھا تھا جہاں وہ چھٹیاں گزارنے اور پرانی یادوں کو تازہ کرنے آتے رہتے تھے۔

'اچھا میں اپنی مصروفیت دیکھ کر بتاتا ہوں۔' ڈاکٹر ماجد قاضی نے جواب دیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ڈاکٹر ماجد قاضی کا فون آیا جس میں انھوں نے رضامندی ظاہر کی۔ 'میرے لیے دہری خوشی کی بات ہے، مجھے ایوارڈ حیدرآباد میں مل رہا ہے۔' پھر مجھ سے کہا۔ 'بقرعید کی چھٹیاں ہیں، آپ بھی میرے ساتھ حیدرآباد چلیے۔'

میں نے فوری ہامی بھر لی۔ ڈاکٹر ماجد قاضی کے ساتھ سفر کرنے اور انھیں ایوارڈ حاصل کرتا ہوا دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ اس سفر کی روداد میں نے اپنے کالم میں 'ایک یادگار سفر' کے عنوان سے لکھی ہے جو میرے دوسرے کالموں کے مجموعہ 'پھر چھڑی بات' میں شامل ہے۔ یہ سفر یادگار اس لیے بھی بن گیا تھا کہ ڈاکٹر ماجد قاضی نے میرے اصرار پر ریاض سے حیدرآباد کا سفر میزبان ایرلائن ایرانڈیا سے کرنے تیار ہوئے تھے اور ایرانڈیا نے حد ہی کر دی تھی۔ نو گھنٹے دیر سے جہاز پہنچا اور ممبئی جا کر انٹرنیشنل فلائٹ ختم کر دی گئی اور ہمیں ڈومیسٹک فلائٹ کے ذریعہ حیدرآباد روانہ کیا گیا۔ اس سفرنامہ کے تین

اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا جن سے ڈاکٹر ماجد قاضی کی شخصیت کو سمجھنے اور سبق حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ ہم اکھٹے ہندوستانی سفارت خانہ گئے۔ سفیر سے ملاقات کی۔ ایرلائنس کے دفاتر کے چکر بھی لگائے۔ دو ایک مرتبہ یوں ہوا کہ ڈاکٹر قاضی کا ڈرائیور کہیں مصروف تھا۔ انھوں نے میری کار میں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں پریشان ہوا۔ فطری بات تھی۔ میری کار چھوٹی ہے جس میں قاضی صاحب کی ڈگریاں اور عہدہ نہیں سما سکتے تھے۔ موصوف الدکتور ماجدالدین قاضی، المستشار بالدیوان الملکی، زمیل بکلیة امراض القلب والشرایین بالولایات المتحده، الطبیب الخاص للمرحوم الملك فهد بن عبدالعزیز ہیں۔ یقین مانیے، اگر عربی نہیں آتی تو میں موصوف کے عہدے کو عربی زبان کا کوئی اعلان سمجھتا!

میں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ 'بھائی میں سائیکل پر سفر کرنے والا آدمی ہوں۔ آپ تو مجھے کار میں بٹھا رہے ہیں۔' پھر موصوف طالب علمی کے دور کی باتیں یاد کرنے لگے۔ 'میں میڈیکل کالج سائیکل پر جایا کرتا تھا۔ اس وقت رات میں سائیکل پر قندیل یا ڈائنمو کی روشنی لازمی تھی۔ بغیر قندیل چالان ہوا کرتا تھا۔ تیز ہوا چلنے سے قندیل گل ہو جاتی تھی۔ چالان سے بچنے کے لیے پولس والے سے کہنا پڑتا تھا کہ آپ چھو کر محسوس کیجیے، قندیل گرم ہے ابھی ہوا سے گل ہوئی ہے۔'

وہ میری کار میں تشریف فرما ہوئے تو میں سوچنے لگا کہ قندیل جلا کر سائیکل چلانے والے طالب علم کے پاس آج کاروں کا قافلہ ہے لیکن وہ ماضی کی یادوں کو سینہ سے لگائے رکھا ہے۔ یہ سادگی حیدرآبادی تہذیب کا خاصہ ہے۔

☆☆ حیدرآبادی مسافروں نے غصّہ کا اظہار کیا۔ گلا پھاڑ کر خوب بحث کی۔ بحث کرنے والوں میں، میں بھی شامل ہو گیا۔ ہماری تکرار کے جواب میں ایک عہدیدار نے کہا۔ 'آپ ایرانڈیا سے کیوں سفر کرتے ہیں۔ اگر ایرانڈیا سے سفر کرنا ہے تو آپ کو سفّر (suffer) بھی ہونا پڑے گا۔'

ایرانڈیا کے اعلی عہدیدار کی صاف گوئی پر مسافر اپنا سا منہ لے کر خاموش ہو گئے کہ غلطی

انھیں کی تھی۔ ڈاکٹر ماجد قاضی اطمینان اور آرام سے بہت cool, cool تھے اور مجھے ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے سفری بیگ سے بسکٹ کا پیکٹ نکالا اور دعوت دی۔ 'ناشتہ کیجیے' اور اسی کول لہجہ میں دریافت کیا۔ 'بھائی یہاں چائے تو مل ہی جائے گی۔'

میں چائے لے آیا تو چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ 'واہ، سفر میں ملنے والی چائے کا مزا ہی دوسرا ہوتا ہے۔ آپ کو ریلوے اسٹیشن پر بڑی پیالیوں میں ملنے والی چائے یاد ہے!'

غصّہ اور بے بسی سے میری حالت ایسی تھی کہ اِس سے لڑوں یا اُس سے بھڑوں جبکہ ڈاکٹر صاحب کے ظرف کا اندازہ لگایئے کہ کاغذی کپ میں چائے ختم کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔ 'چائے سے تازگی کا احساس ہو رہا ہے۔ ایک کپ اور چلے گی۔'

یہی صبر، ہمت، برداشت، ثابت قدمی اور استقلال نے ڈاکٹر ماجد قاضی کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ بہت کم لوگوں میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میں اسے خدا کی دین گردانتا ہوں۔

☆ ☆ ☆ ایر ہوسٹس کی آواز آئی۔ 'ہم حیدرآباد پہنچ چکے ہیں۔ اس وقت صبح کے گیارہ بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے ہیں اور باہر کا تاپمان پندرہ ڈگری ہے۔۔۔'

میں آنکھیں کھول کر غور سے دیکھنے لگا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔ جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو حیدرآباد نظر آنے لگا۔ ہم دونوں خوش ہوئے کہ آخر ہم حیدرآباد پہنچ ہی گئے۔ ہم اپنے آپ کو سمیٹنے لگے۔ ایر ہوسٹس کا اعلان جاری تھا۔ 'ایر انڈیا سے سفر کرنے کے لیے دھنیہ واد۔'

'کاہے کا اور کیسا دھنیہ واد! نو گھنٹے دیر سے پہنچے ہیں۔' میں بڑبڑایا۔

ڈاکٹر ماجد قاضی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سمجھایا۔ 'بھائی اگر جہاز لیٹ نہ ہوتا تو کیا ہم اس سفر کو یاد رکھتے! شاید نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے وہ ہمارے سفر کو یادگار بنانے کے لیے مشیّت ایزدی تھی۔'

ڈاکٹر ماجد قاضی کو 'پرَاواسی بھارتیہ سمّان ایوارڈ' ان کے پیارے شہر حیدرآباد میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے ہاتھوں دیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں، میں بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے ہاتھوں ایوارڈ حاصل اور ان سے ملاقات کر کے ڈاکٹر

ماجد قاضی بہت خوش تھے۔ اپنی خوشی کا انھوں نے کچھ اس طرح اظہار کیا تھا کہ 'مجھے ہندوستان کے صدر سے مل کر، ان سے مصافحہ کر کے اور انھیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میں ان کی لیاقت، دانشمندی، انداز گفتگو، عجز وانکساری سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے تلقین کی کہ ہم کبھی اپنی ہندوستانیت کو ترک نہ کریں۔'

ڈاکٹر ماجد قاضی کا انتقال 8 نومبر 2019ء کو جدّہ، سعودی عرب میں ہوا۔ ان کی عمر 81 برس تھی اور پسماندگان میں اہلیہ کیرول این قاضی، دو بیٹے شمس قاضی اور کمال قاضی اور دو بیٹیاں انیس اور سامیہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد

میں ایم بی بی ایس سال دوم کا طالب علم تھا اور یہ سنہ 1974ء کی بات ہے، اس وقت ڈاکٹر شیام سندر پرساد کا شہرہ ہوا کہ امریکہ اور برطانیہ سے تربیت یافتہ ماہر امراضِ چشم نے قلب شہر میں اپنا مطب کھولا ہے۔ میں نے بھی آنکھوں کے ایک کہنہ مسئلہ کے سلسلہ میں ان سے رجوع ہونے کا فیصلہ کیا۔ پیدائش کے بعد سے سبھی کو ایک نظر سے دیکھنے کی پاداش میں میری سیدھی آنکھ سست اور کاہل ہوکر ناکارہ بن چکی تھی۔ ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے تفصیلی معائنہ کیا اور مشورہ دیا 'چوں کہ وقت نکل چکا تھا، اس لیے کچھ زیادہ کرنا ممکن نہیں ہے۔' میری بینائی کا یہ مسئلہ برقرار ہے اور اب بھی میں دنیا کو ایک نظر ہی سے دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد سے جو بھی ملتا ان کے اخلاق اور طرز عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا سو میں بھی ان سے متاثر ہوا اور گاہے ماہے دوست احباب کو ان کے یہاں مشورے کے لیے لے جاتا رہا۔ دو ایک ادبی محفلوں اور پیشہ وروں کی میٹنگس میں بھی ان سے ملاقاتیں رہیں اور ان سے ہر ملاقات باعث مسرت ہوتی۔ پھر میں سعودی عرب چلا گیا۔ اس دوران شاید ہی ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

سعودی عرب سے واپسی کے بعد میں نے ڈاکٹر شیام سندر پرساد کو اردو ہال کے ایک جلسہ میں سنا اور ان سے ملاقات کی تجدید بھی ہوئی۔ ستمبر 2017ء میں 'ممتاز ماہرِ چشم ڈاکٹر شیام سندر پرساد

کے ساتھ ایک شام' کے عنوان سے انجمن ترقی پسند مصنفین نے 'حیدرآباد کی چند یادیں اور چند باتیں' سلسلے کے توسیعی لیکچر کا انعقاد عمل میں لایا تھا۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف شہر ایک دوسرے ماہر امراض چشم ڈاکٹر سکندر علی خان لودھی نے کروایا تھا۔

اپنے خطاب میں ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ 'مشترکہ خاندان اور ہمہ لسانی تہذیب ہماری زندگیوں کا اہم حصّہ تھے۔ اساتذہ اور بڑوں کا ادب واحترام ہم پر لازم تھا جبکہ اساتذہ کے اندر بھی طلبہ کے تئیں بے مثال جذبہ محبت ہوتا تھا۔ بلا لحاظ مذہب اور ذات پات ہمارے درمیان خلوص ومحبت اور ایثار کا جذبہ عام تھا۔۔۔ مہمان نوازی ریاست حیدرآباد کی تہذیب کا بنیادی حصّہ ہے۔ دنیا بھر میں حیدرآباد اور حیدرآبادیوں نے اخوت، بھائی چارہ اور مذہبی رواداری کی شاندار مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ کہیں پر بھی جائیں اگر کوئی حیدرآبادی سے ملاقات ہوتی ہے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ مخصوص لہجہ اور تکیہ کلام ہماری پہچان ہے۔ ہم کہیں پر بھی رہیں ہمارا مخصوص لہجہ حیدرآبادی ہونے کی گواہی دیتا ہے۔'

جب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے 'اردو مرکز برائے فروغ علوم' میں مشیر کی حیثیت سے وابستہ تھا تب ہم نے ڈاکٹر شیام سندر پرساد کو 'قومی اردو سائنس کانگریس 2020ء' میں بحیثیت مہمان اعزازی مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تو ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں۔ ہم انھیں دعوت دینے گئے تو میں نے اپنی دو کتابیں انھیں پیش کیں۔ وہ خوش ہوئے اور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی آپ بیتی ہمیں تحفے میں دی۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے 'قومی اردو سائنس کانگریس' کے افتتاحی اجلاس منعقدہ 25 فروری 2020ء میں شرکت اور متاثر کن تقریر کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کی مادری زبان اردو ہے اور کہا کہ 'اردو ایک مشترکہ تہذیب کی زندہ زبان ہے۔ اردو شاعری اور ادب کی زبان تو ہے ہی لیکن ساتھ میں یہ ایک علمی اور سائنس کی ترسیل کی زبان بھی ہے۔ اردو کی اس صلاحیت کا ثبوت جامعہ عثمانیہ ہے۔'

ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے انگریزی زبان میں اپنی آپ بیتی ' Tryst With

'Destiny' لکھی جو سنہ 2019ء میں شائع ہوئی۔اس آپ بیتی سے ہمیں ڈاکٹر صاحب کی زندگی، تعلیم، پیشہ ورانہ کامیابیوں اور ان کے افکار اور خیالات کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے ان پر خاکہ تحریر کیا تھا جو اخبار سیاست کے 'میرا کالم' میں چھپا تھا۔محبوب اصغر نے ڈاکٹر شیام سندر پرساد پر مضمون لکھا ہے۔عام اور طبّی جرائد میں بھی آپ کے متعلق لکھا جاتا رہا ہے اور خبریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔میرے کہنا کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر شیام سندر پرساد اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد 12 ستمبر 1937ء کو حیدرآباد کے ایک جاگیردار برہما کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔آپ کی پرورش مشترکہ خاندان میں ہوئی۔خاندان کے سبھی بچے ساتھ رہتے، کھیلتے اور پڑھتے ہوئے بڑے ہوئے۔ڈاکٹر صاحب نے اسکولی تعلیم آل سینٹس ہائی اسکول میں بذریعہ انگریزی زبان حاصل کی۔گھر پر اردو اور فارسی کی تعلیم ہوئی۔وہ اپنے بچپن کی یادوں اور روزمرّہ کی باتوں کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے اس وقت کی حیدرآبادی تہذیب کا اندازہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ صبح کا آغاز پرتکلف ناشتہ سے ہوتا جس میں کھچڑی، میٹھا اچار، پاپڑ، قیمہ، انڈے کا چیلا یا خاگینہ وغیرہ ہوتے تھے اور بچے پیدل چلتے ہوئے اسکول جاتے جو گھر سے قریب تھا۔

گورنمنٹ سٹی سائنس کالج سے ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے پی یو سی کیا۔اس دوران وہ کالج کے 'ہندی سنگھ' کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ایک سالہ پی یو سی کے بعد آپ کا داخلہ سنہ 1956ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا اور آپ نے سنہ 1961ء میں پانچ سالہ ایم بی بی ایس کورس مکمل کیا۔ طب کی تعلیم کے دور کو ڈاکٹر صاحب بڑی محبت اور فخر سے یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عثمانیہ میڈیکل کالج ایک شاندار تعلیمی ادارہ ہے جس کا شمار ملک کے قدیم اور بہترین اداروں میں ہوتا ہے۔یہ ادارہ ایک شاندار ماضی رکھتا ہے۔یہیں پر بے ہوشی کی دوا کے طور پر کلوروفام کی دریافت ہوئی تھی۔ایسے ادارہ میں تعلیم پانا باعثِ افتخار ہے۔۔۔عثمانیہ میڈیکل کالج اور عثمانیہ جنرل ہاسپٹل نے کئی قابل اور ماہر معالجین کی تربیت کی ہے جنھوں نے بیمار انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے۔ڈاکٹر شیام سندر پرساد

کے اساتذہ میں ڈاکٹر بہادر خان، ڈاکٹر چلپتی راؤ، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، ڈاکٹر بنکٹ چندر، ڈاکٹر بی کے نائیک، ڈاکٹر ایس آر راؤ، ڈاکٹر انصاری شامل ہیں۔ تعلیم کے دوران ڈاکٹر شیام سندر پرساد ایک سال کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

ہاؤز سرجن شپ کے دوران امریکہ جانے کا امتحان ای سی ایف ایم جی (ECFMG) پاس کیا اور سنہ 1962ء میں ڈاکٹر شیام سندر پرساد امریکہ گئے اور تین سال تک (1963-66ء) وہاں آپتھالمالوجی (Ophthalmology، عینیات، علم العیون) میں ریسیڈنسی کی۔ پھر امریکہ سے ڈاکٹر صاحب برطانیہ منتقل ہوئے۔ برطانیہ میں انھوں نے ایف آر سی ایس (FRCS, Lond) اور ایف آر سی آپھتھ (FRCOphth) اور ڈی اُو (DO) کی ڈگریاں حاصل کیں اور وطن واپسی کا ارادہ کیا۔

اپنی آپ بیتی میں ڈاکٹر شیام سندر پرساد لکھتے ہیں کہ 'جب وطن واپسی کی خواہش کا اظہار چیرمین سے کیا تو اس نے حیرت کرتے ہوئے کہا۔'لوگ یہاں کام کرنے کا خواب دیکھتے ہیں اور تمھیں کنسلٹنٹ کا پوسٹ بھی دینا چاہتے ہیں اور تم ہے کہ واپس جانا چاہتے ہو۔'

میں نے چیرمین اور دوسروں کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے جدید آلات کی فہرست اور ان کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔'

ڈاکٹر شیام سندر پرساد کی یہ خواہش قبول کرلی گئی اور وہ اپنے ساتھ جدید آلات اور امریکی اور برطانوی تجربہ اور ڈگریاں لے کر سنہ 1973ء میں خوشی خوشی اپنے وطن حیدرآباد واپس ہوئے۔ برطانیہ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے چچا/ ماموں ڈاکٹر پی رام چندر جو شہر کے نامور ماہر امراضِ چشم اور جنھیں ڈاکٹر صاحب پپّا کہتے تھے، کے ساتھ شاید سال بھر کام کیا اور سنہ 1974ء میں مرلیدھر باغ، عابڈس پر اپنے گھر میں برطانیہ سے لائے ہوئے آلات کے ساتھ خود کا آئی کلینک شروع کیا۔

مقامی فرد ہونے، اردو زبان اور حیدرآبادی تہذیب سے واقفیت کے سبب ڈاکٹر شیام سندر پرساد بہت جلد مقبول ہوئے اور ان کا کلینک مریضوں سے بھرا رہنے لگا جن میں پرانے شہر کے

غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کی خاصی تعداد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ 'ہم نے پیسہ کی پرواہ کیے بغیر ہر کسی کی خدمت کی، جو دیے وہ لے لیا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ بہت کم لوگوں کو دوسروں کی خدمت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو لوگوں کی خدمت کے لیے منتخب کیا ہوا بندہ سمجھتا ہوں اور اسی خیال سے مریضوں کی خدمت میں لگا رہا۔'

ڈاکٹر شیام سندر پرساد نے سنہ 1984ء میں اپنا ذاتی آنکھوں کا دواخانہ اور تحقیقی مرکز قائم کیا جس کا نام 'کنچن آئی ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سنٹر' رکھا جس کے وہ ڈائرکٹر رہے۔ یہ بارہ بستروں والا دواخانہ اور تحقیقی مرکز تھا۔ سنا ہے کہ یہ دواخانہ اور تحقیقی مرکز اب ڈاکٹر صاحب کے بھتیجوں کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد کی پیشہ ورانہ زندگی بہت شاندار اور کامیاب بھی رہی ہے۔ اپنی پسند کی اسپیشالیٹی میں اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی اور وطن واپس ہو کر اپنا کلینک اور دواخانہ قائم کیا۔ اپنوں اور اپنے پسندیدہ شہر میں کامیاب اور کامران رہے اور خوب نام کمایا۔ تحقیق کی اور مقالے پیش کیے۔ کانفرنس اور سمیناروں میں شرکت کی۔ کئی ممالک بشمول پاکستان کا دورہ کیا۔ ملک اور بیرون ملک ایوارڈس سے نوازے گئے۔ ڈاکٹروں کی نئی نسل کو پڑھایا اور سکھایا۔ توسیعی لیکچرس اور خطبات دیے۔ غرض انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو ایک ڈاکٹر اپنی زندگی میں حاصل کرنے کی تمنا کر سکتا ہے۔

اپنے کیریر کے عروج پر سنہ 2009ء میں ڈاکٹر شیام سندر پرساد کینسر جیسے خطرناک مرض میں مبتلا ہوئے۔ یہ ان کے لیے صدمہ کا باعث بنا اور دل بھی اداس ہوا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی بہادری سے کینسر اور تقدیر کے اس اقدام کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے۔ ان میں مایوسی اور ناامیدی کی جگہ امید اور مثبت سوچ نے لی۔ کینسر سے متاثر ہونا اور مقابلہ کرنا ہی دراصل آپ بیتی کا محرک بنا اور انھوں کینسر سے مقابلہ کو پہلا باب بنایا۔ اس آپ بیتی میں ایک ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ جب کوئی خطرناک مرض سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا مقابلہ کیسے کیا جانا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'زندگی کے لیے مثبت سوچ بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی مثبت سوچتا ہے تو آواز موسیقی بن جاتی ہے، حرکت

رقص بن جاتا ہے اور مسکراہٹ ہنسی میں بدل جاتی ہے۔ ہر کسی کو مسائل سے آگے بڑھ کر زندگی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔'

ڈاکٹر شیام سندر پرساد اچھی اور تیکھی حسِ مزاح رکھتے تھے۔ احباب سے ان کی گفتگو دلچسپ اور پرلطف ہوا کرتی تھی۔ ان کی حسِ مزاح کلینک کے سنجیدہ اور اداس ماحول کو آرام دہ اور پرامید بنا دیتی تھی۔ انھیں مریضوں سے باتیں کرنا اور انھیں سننا پسند تھا۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے پریشان ذہنوں کو آرام ملتا ہے جو شفایاب ہونے میں بھی مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر شیام سندر پرساد کو اردو زبان، ادب اور تہذیب سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اردو بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ اخبار 'سیاست' کے وہ قاری بتائے جاتے ہیں۔ وہ مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی کو پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی کلینک میں آنکھ سے متعلق اشعار آویزاں کر رکھے تھے۔ دو اشعار جو ان کے مطب کی زینت تھے کی تصویر میں نے لی تھی، ان اشعار اور اس تصویر کو پیش کیا جاتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اردو میں بے دریغ انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں یا

ڈاکٹر شیام سندر پرساد، ماہر امراض چشم کی کلینک میں آویزاں دو اشعار

☆

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
اقبال

☆

زبان بندی سے گھبرا کر کسی کا دم نہ گھٹ جائے
یہی کچھ سوچ کر فطرت نے آنکھوں میں زباں رکھدی
شجیع
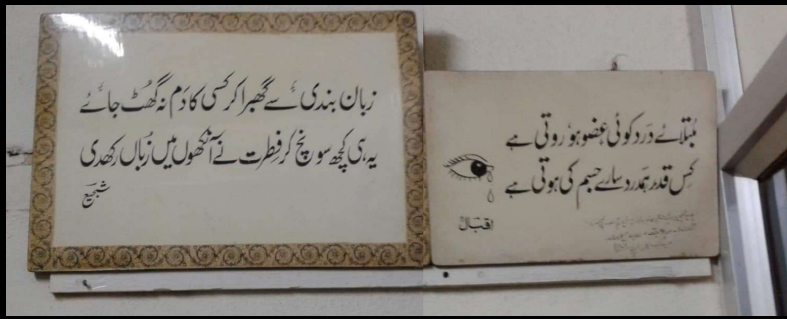
اردو بولتے بولتے انگریزی میں گویائی کرنے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ انگریزی سے مرعوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔لیکن میں نے اردو زبان کی محبت میں ڈاکٹر شیام سندر پرساد کو اس کا الٹ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ انگریزی میں اردو اشعار، الفاظ اور جملوں کا برملا اور برمحل استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی آپ بیتی گو کہ انگریزی زبان میں ہے ڈاکٹر صاحب نے انگریزی متن میں اردو اشعار اور الفاظ کا کئی موقعوں پر استعمال کیا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سونے کے زیور میں نگینے جڑ دیے گئے ہیں۔ مثال کے لیے اپنی تربیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

We were brought up in true Hyderabadi culture, with a wide horizon of thinking, devoid of prejudices. This gave us a multifaceted personality with values of ***adab*** *(manners)*, ***aqlaaq*** (etiquette), ***khuloos*** (affection), ***mohabbat*** (love), ***bhai chargee*** (brotherhood), ***mahmaan nawazi*** *(hospitality),* ***khidmath*** *(service-mindedness)* and equal faith in human beings. Our basic approach to life was guided by the motto 'Service to man is service to God'. Hyderabad was a wonderful example of composite culture, with people of all faiths living together in perfect hormony.

اپنی انگریزی آپ بیتی میں ایک دوسرے مقام پر اردو زبان اور شاعری سے محبت کا یوں اعتراف کرتے ہیں۔

I believe that poetry gives best expression to one's deepest thoughts. Hence, I end with a couplet

in Urdu, a language I love.

'Maut ki umar hi kya hai? Do pal bhi nahin

Zindagi silsila hai, aaj kal ka nahin.'

ڈاکٹر شیام سندر پرساد کی تقاریر اور انٹرویوز میں بھی یہی چلن دیکھا گیا ہے کہ انگریزی میں اردو الفاظ ٹانکتے یا اردو جملے کہہ جاتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اردو میں شاعری بھی کیا کرتے تھے بلکہ کسی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ہندی اور انگریزی میں بھی شاعری کی ہے۔ لیکن تلاش کے باوجود ان کے کلام تک رسائی نہیں ہوسکی۔

اردو زبان وادب سے بے پناہ محبت کرنے والے ڈاکٹر شیام سندر پرساد کا انتقال اسّی سال کی عمر میں 30 مئی 2020ء کو ہوا۔

ڈاکٹر سکندر حسین

سقوطِ حیدرآباد (ستمبر 1948ء)اور جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کردینے کے دور میں شہرِ حیدرآباد سے ایک اردو روزنامہ 'سیاست' کا رسم اجرا (15 اگسٹ 1949ء) عمل میں آیا تھا۔اس اخبار نے بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی اور شہر اور سابق ریاست حیدرآباد اور جدید آندھراپردیش کے اردو والے اس اخبار کو اپنا دست تعاون دراز کرنے لگے۔اخبار پڑھنے اوراس میں لکھنے لگے جن میں نامور ڈاکٹرس بھی شامل ہیں۔

سیاست اخبار میں ڈاکٹرس کے مضامین کے علاوہ ان کے انٹرویوز بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ڈاکٹر مجید خان سیاست میں ہر ہفتہ پابندی سے کئی برسوں تک لکھتے رہے۔ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کی پہلی ترجیح بھی اخبار سیاست ہی تھا۔ڈاکٹر سید عبدالمنان،ڈاکٹر اظہر حسین،ڈاکٹر قمر حسین انصاری، ڈاکٹر حیدر خان اور دوسرے ڈاکٹرس کے مضامین اخبار سیاست کی زینت بن چکے ہیں۔خود میرا پہلا طبّی مضمون بھی اسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔

اخبار 'سیاست' میں شائع ہونے والے ڈاکٹرس میں ایک اہم نام ڈاکٹر سکندر حسین ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین بڑی دلچسپی سے سیاست میں پڑھتا رہا ہوں اوران کی تین کتابیں بھی میرے پاس ہیں۔مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر سکندر حسین فعلیات یعنی فزیالوجی (Physiology) کے استاد (پروفیسر) ہیں۔سعودی عرب میں قیام کے دوران سنا تھا کہ آپ قصیم میڈیکل کالج میں

پروفیسر ہیں۔لیکن کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

جب میں نے ڈاکٹر سکندر حسین کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا تو سوچا کہ آپ سے ملنا چاہیے۔ملاقات کے مقصد سے میں نے ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر حاصل کر کے کال کیا تو فون بند آیا لیکن واٹس ایپ پر رابطہ قائم کیا تو ڈاکٹر سکندر حسین نے بتایا کہ وہ اپنے فرزند کے پاس ہندوستان سے باہر ہیں۔دو چار مہینے بعد پھر میں نے ملاقات کی کوشش کی تو اس مرتبہ پتہ چلا کہ وہ شہر سے باہر ہیں۔ یوں اب تک ان سے بالمشافہ گفتگو نہیں ہوئی ہے،بس فون اور واٹس ایپ پر ہی رابطہ ہو رہا ہے۔امید ہے کہ جلد ملاقات بھی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سکندر حسین شہر حیدرآباد میں 26 اکتوبر 1944ء کو پیدا ہوئے۔آپ بوہرہ مسلمان ہیں اور آپ کے والد کا نام شبیر حسین ہے۔ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول، دریچۂ بواہیر میں ہوئی اور اسکولی تعلیم اردو شریف اور سٹی ہائی اسکول میں ہوئی۔

ڈاکٹر سکندر حسین کا داخلہ گاندھی میڈیکل کالج میں ہوا جو جامعہ عثمانیہ کا دوسرا ملحقہ طبّی کالج تھا۔انھوں نے سنہ 1968ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی کالج سے سنہ 1980ء میں فزیالوجی (Phsiology،فعلیات) یعنی علم الافعال الاعضاء میں ایم ڈی کیا۔

فزیالوجی کو اناٹومی (Anatomy،تشریح الابدان) کے ساتھ میڈیکل کالج کے پہلے ڈیڑھ سالہ دور میں پڑھایا جاتا ہے اور ڈاکٹر سکندر حسین حیدرآباد اور بیرون ملک مختلف سرکاری اور خانگی میڈیکل کالجوں بحیثیت استاذ (پروفیسر) فائز رہے ہیں اور طب کے طالب علموں کو درس دینے میں مصروف رہے۔

پروفیسر سکندر حسین نے تبریز میڈیکل کالج ایران میں پڑھایا اور تقریباً دس برس تک وہ القصیم میڈیکل کالج،سعودی عرب میں فزیالوجی کے پروفیسر رہے۔حیدرآباد کے دکن میڈیکل کالج میں وہ پروفیسر فزیالوجی اور وائس پرنسپل بھی رہے۔آخر میں وہ وی آر کے میڈیکل کالج میں فزیالوجی کے صدر شعبہ کی حیثیت سے معمور رہے۔اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے شاگرد دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔موصوف کے دو ایک شاگردوں سے میری ملاقات ہوئی ہے۔پروفیسر

صاحب کے ایک شاگرد سرجن ڈاکٹر عمر بن حسن نے بتایا کہ سر کا پڑھانے کا انداز بہت اچھوتا ہے، روزمرّہ کی مثالوں سے وہ اعضاء کی فعلیات ایسے سمجھاتے ہیں کہ نفس مضمون آسانی سے سمجھ میں آتا اور ذہن نشین بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سکندر حسین نے تحقیق بھی کی اور پچیس سے زائد مقالے بھی لکھے جو سائنسی اور طبی جرائد میں شائع ہوئے۔ انھوں نے ان مقالوں کو سمینار اور کانفرنس میں پیش بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو توسیعی لیکچر دینے کے لیے دہلی، علی گڑھ اور حیدرآباد کے مختلف اداروں میں مدعو بھی کیا جاتا رہا ہے۔

ڈاکٹر سکندر حسین نے ایک تحقیقی مقالہ بعنوان 'ریاستِ حیدرآباد میں 1884 سے 1950ء: اردو ایلو پیتھک طب کی تدریسی زبان' لکھا ہے جو نہایت معلوماتی ہے۔

ڈاکٹر سکندر حسین کی علمی خدمات پر سلطان البواہیر سیدنا محمد برہان الدین صاحب نے انھیں 'الشیخ' کے خطاب سے نوازا ہے۔

طب کی تعلیم کے دوران ہی سے ڈاکٹر سکندر حسین سائنسی اور طبّی مضامین لکھنے لگے تھے جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مضامین لکھنے کی تحریک سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ 'ہر انسان میں تجسّس (Curiosity) کی ایک فطری خواہش پائی جاتی ہے، اس کی ذہنی سطح چاہے کیسی بھی ہو لیکن تجسّس کا یہ رجحان کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ سیب نیچے ہی کیوں گرتا ہے، اوپر کیوں نہیں جاتا؟ تارے رات ہی میں کیوں نظر آتے ہیں، دن میں کیوں نہیں؟ دل، پھیپھڑے، گردے وغیرہ کس طرح کام کرتے ہیں؟ جسم میں داخل ہونے کے بعد غذا پر کیا گزرتی ہے؟

اس قسم کے بہت سارے سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ کلبلاتے رہتے ہیں۔ تجسّس کی اسی خواہش نے مجھے میڈیسن میں داخلہ لینے کی طرف مائل کیا اور جب میں نے علم کے اس بحرِ بیکراں میں قدم رکھا تو مجھے پتہ چلا کہ اگرچہ اس لامحدود کائنات میں انسان کا مقام ایک ذرّہ سے بھی زیادہ حقیر ہے لیکن اس معمولی سے جسم کا ہر ایک خلیہ، خون کا ہر ایک قطرہ، دل کی ہر ایک دھڑکن، آنکھوں کی ہر ایک جھپک دراصل ایک عظیم قانون اور ایک مخصوص ترتیب کے تحت اپنا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔۔۔

مضامین میں آپ کو ان عجائبات کی ایک معمولی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا تصفیہ کرنا آپ کا کام ہے۔'

ڈاکٹر سکندر حسین کے مضامین ترجیحی طور پر اخبار سیاست میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے جرائد میں بھی آپ کے مضامین شائع اور ڈائجسٹ ہوئے ہیں۔ قارئین آپ کے مضامین توجہ سے پڑھتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سکندر حسین نے اپنے مضامین کے مجموعوں کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا ہے۔ اب تک موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب 'ظہورِ ترتیب' سنہ 1979ء میں شائع ہوئی۔

دوسری کتاب 'انسان ایک عجوبہ' سنہ 1993ء میں چھپی اور تیسری کتاب 'عجائباتِ زندگی' سنہ 1998ء میں شائع ہوئی ہے۔ 'مہد سے لحد تک' چوتھی کتاب کا نام ہے جو سنہ 2014ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں ڈاکٹر سکندر حسین کے ساتھ ان کے بیٹے ڈاکٹر مقداد بھی شامل ہیں۔ پانچویں کتاب گردوں یعنی Kidneys پر ہے جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

ڈاکٹر سکندر حسین کے مضامین اور ان کی طرزِ تحریر کے متعلق محترم محبوب حسین جگر، سابق جوائنٹ ایڈیٹر روز نامہ سیاست، نے ڈاکٹر صاحب کی کتاب عجائباتِ زندگی میں 'یہ کتاب' کے عنوان سے جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کی ادبی قدر و قیمت بھی ہے۔ جگر صاحب کی یہ رائے ڈاکٹر سکندر حسین کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

'سکندر حسین صاحب جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں بہت عرصہ تک بالالتزام سنگلاخ موضوعات پر 'سیاست' کے لیے مضامین لکھتے رہے اور مجھے ان کا ہر مضمون پڑھ کر تعجب ہوتا تھا کہ وہ ان مضامین کے لیے مال مسالہ کہاں سے لاتے ہوں گے۔ ان کی انشا پردازی کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ وہ ایم بی بی ایس میں زیرِ تعلیم تھے۔ ڈاکٹر یا زیرِ تربیت ڈاکٹر کے لیے اس قسم کے عنوانات پر ٹکنیکل انداز میں اظہارِ خیال کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن میڈیکل سائنس کا ادب و روایات سے رشتہ جوڑنا کسی ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں۔ سکندر صاحب کا کوئی بھی مضمون شروع کیجیے تو ابتدا میں آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کوئی ادبی تحریر پڑھ رہے ہیں۔ 'بال' کا تذکرہ شروع ہوگا تو زلف

ومژگان سے! آئینہ کا تصور بھی آئے، آگ اور گھنگھور گھٹاؤں کی تشبیہ بھی یاد آجائے گی۔ سکندر اپنے مختصر سے کینوس میں قاری کو زینہ زینہ کر کے انسانی بالوں کی طبّی اہمیت وافادیت کی منزل تک لے جائیں گے اور پھر 'بفا' گنجے پن اور بالوں کے امراض سے بچنے کی تدابیر بتائیں گے۔

'چھینک' پر لکھنے چلے ہیں تو پہلے چھینک سے وابستہ روایات پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالیں گے اور بڑی بوڑھیوں کی آواز کی نقل کریں گے کہ 'بیٹا دہلیز پر چھینک آرہی ہے تو اتارا کرو، یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے!' دودھ پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں تو شروع ہی میں یہ نہیں لکھیں گے کہ اس میں وٹامن اور پروٹین ہوتے ہیں بلکہ آپ کو تاریخ کی ورق گردانی کرائیں گے کہ دودھ کا کن کن قدیم اور مذہبی اندازوں میں کن کن ناموں سے ذکر کیا گیا ہے۔

ایک بڑے ادیب سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے حقیر، بے جان اور چھوٹے چھوٹے موضوعات پر اتنے اچھے مضامین کیسے لکھ لیتے ہیں اور اس نے جواب میں کہا تھا 'حسین خیالات کے لباس کو ٹانگنے کے لیے ایک کھوٹی ہی تو درکار ہوتی ہے۔ اچھی ہو کہ بری۔ بس ایسی ہو کہ اس لباس کو سہار سکے'۔۔ سکندر صاحب پر یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، وہ موضوع کو اپنے انداز بیان سے ایک نیا روپ عطا کرتے ہیں۔'

ڈاکٹر سکندر حسین کی تحریروں سے اب چند ایسے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو محبوب حسین جگر صاحب کی رائے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ 'پہلی چیخ' عنوان سے لکھے گئے مضمون کا آغاز ملاحظہ فرمائیں۔ 'چونکیے مت۔ یہ نہ کوئی جاسوسی کہانی ہے اور نہ ہی جرم وسزا کی کوئی داستان۔ یہ دراصل ذکر ہے اس پہلی چیخ کا جو ہماری زندگی کے آغاز کا اعلان کرتی ہے۔ نومولود کی وہ پہلی چیخ جسے سن کر نہ صرف رشتہ داروں اور دوستوں میں مبارک سلامت کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں بلکہ شدید درد وکرب میں مبتلا ماں کے چہرے پر بھی مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بچے کی یہ پہلی چیخ دراصل پھیپھڑوں میں پہلی بار ہوا پہنچنے کی علامت ہے۔ یہ چیخ دراصل پہلی سانس کا نتیجہ ہے۔'

مضمون 'قد وقامت' میں تمہید یوں باندھی گئی ہے کہ 'قد وقامت جس کا سلسلہ شاعروں نے فتنہ قیامت سے ملایا ہے، جسے انھوں نے سرو صنوبر سے تشبیہ دی ہے، اسی قد کو سراغ رسانوں نے

شناخت کا ایک اہم ذریعہ بنایا ہے۔سائنس دانوں نے اسے موروثی ونسلی خصوصیات کا مظہر قرار دیا ہے۔ ماہرین نفسیات نے اسے اخلاق وجذبات سے جوڑا ہے تو طبیبوں نے اسے بیماریوں کی پیش قیاسی کے لے ایک بنیاد سمجھا ہے۔غرض قد وقامت ایک ایسا عنوان ہے جس میں سائنس کے کئی دلچسپ پہلو پوشیدہ ہیں۔'

'حواسِ خمسہ' کا ادب اور سائنس کا امتزاجی تعارف دیکھیے۔'حواس خمسہ دراصل وہ پانچ اہم احساسات ہیں جن سے ہماری زندگی کی ساری دلچسپیاں وابستہ ہیں۔آنکھ، ناک، کان، زبان اور جلد خالق کائنات کی عطا کی ہوئی وہ پانچ نعمتیں ہیں جن کے بغیر ہمارا جینا حرام ہوجائے۔یہی وہ اعضا ہیں جو ہمارے ماحول سے تعلق رکھنے والے احساسات کو برقی لہروں کی شکل میں دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ جہاں ان اطلاعات کو حافظہ (Memory) کی شکل میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ محققین نے انسانی بال سے بھی باریک فولادی تار بنائے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے دماغ کے مختلف حصّوں میں برقی لہریں پہنچا کر چند اہم مراکز کی نشاندہی کی ہے جو حسی رقبے (Sensory Areas) کہلاتے ہیں۔ یہ مراکز جسم کے مختلف حصّوں سے پیغامات کو وصول کرتے ہیں اور انھیں 'احساس' کی شکل میں ڈھالتے ہیں۔مثلاً اگر آپ نے کوئی منظر دیکھا تو اس کا احساس دماغ کے مرکز بصارت تک پہنچتا ہے۔اگر آپ کوئی تقریر سنتے ہیں تو اس کے الفاظ دماغ کے مرکزِ سماعت تک پہنچتے ہیں۔آپ بریانی تناول کرتے ہیں تو لذت ولطف کی لہریں مرکزِ ذائقہ تک پہنچتی ہیں۔اسی طرح دماغ میں خوش بو، حرارت، دباؤ اور لمس وغیرہ کے بھی علیحدہ علیحدہ مراکز ہوتے ہیں۔'

انسان کی دلچسپ تعریف ڈاکٹر سکندر حسین کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے کہ 'یہ انسان تعجب کے قابل ہے کہ وہ چربی سے دیکھتا ہے، گوشت سے بولتا ہے، ہڈی سے سنتا ہے اور ایک سوراخ سے سانس لیتا ہے اور انسان کی ہر سانس ایک قدم ہے جو اسے موت کی طرف بڑھائے لیے جارہا ہے۔'

اوپر دی گئی مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ڈاکٹر سکندر حسین کی تحریریں سائنسی اور معلوماتی ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں اور قارئین کو ایک نیا ذائقہ پیش کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر سید تقی عابدی

اسّی کے دہے کی بات ہے جب میں حیدرآباد شہر کی ادبی محفلوں میں حصّہ لینا شروع کیا تھا اور دو ایک محفلوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کو مضامین پڑھتے ہوئے سنا اور دیکھا تھا۔ پھر میں ان کی طرح این آر آئی بن کر ریاض، سعودی عرب چلا گیا۔ سعودی عرب کے قیام کے دوران موصوف کے بارے میں اوران کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ وطن واپسی کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی سے دو مرتبہ سرسری ملاقات رہی لیکن تفصیلی ملاقات کا کبھی موقع نہیں ملا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے متعلق معلومات اوران کے ادبی کارناموں کی تفصیل بہت آسانی سے مل جاتی ہیں۔ کتب خانوں میں ان کی کتابیں اوررسائل میں ان کے بارے میں مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ اسمارٹ فون یا لیپ ٹاپ پر ان کی ویب سائٹ (www.taqiabedi.com) پر چلے جائیے اور وہاں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے، ان کی کتابیں اوران کے بارے میں مضامین پڑھیئے، ان کے آڈیوز سنیئے اوران کی تصاویر اور ویڈیوز دیکھیئے۔ جی چاہے تو ان سے رابطہ بھی کیجیے۔ ان کی کتابیں ریختہ ڈاٹ اورگ (www.rekhta.org) پر بھی دستیاب ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی ان سے متعلق مواد مل جاتا ہے۔ میرے خیال میں جتنا ڈیجیٹل مواد ڈاکٹر تقی عابدی کے بارے میں موجود ہے شاید ہی دوسرے اردو ادیبوں اورشاعروں کا ہوگا!

انٹرنیٹ پر موصوف کا مختصر تعارف اسکرین پر یوں ابھرتا ہے کہ 'سید تقی حسن عابدی

ہندوستانی نژاد کینیڈین فزیشین ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ اردو زبان کے اسکالر بھی ہیں۔'

مختلف ادیبوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کے بارے میں تعارفی مضامین بھی تحریر کیے ہیں، مجھے جمال عباس فہمی کا لکھا یہ مختصر تعارف پسند آتا ہے۔'ڈاکٹر تقی عابدی ان شخصیات میں ہیں جن کے شوق اور پیشے میں باہم ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ وہ انسانی امراض کے ڈاکٹر ہیں لیکن ادب ان کے رگ و ریشے میں رچا بسا ہے۔ رگ و ریشے میں گردش کرتا ہوا اردو ادب ہی تقی عابدی کو تحقیق و تنقید، تشریح و ترجمہ، تصنیف و تالیف، تدوین و ترتیب، تجزیہ اور شعر گوئی میں مصروف رکھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ اپنے قلم کی گردش سے اردو ادب کے دامن کو تقریباً ستر قیمتی کتابوں کے سرمایہ سے مالا مال کر چکے ہیں۔ ان کا رخشِ قلم ہے کہ بے تکان دوڑ رہا ہے۔'

زبیر صدیقی، کراچی، پاکستان نے ایک کتاب 'سید تقی عابدی (شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ)' تصنیف کی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ 'اردو ادب کی معروف شخصیت ڈاکٹر سید تقی عابدی (ایم ڈی) اردو کی نئی بستیوں اور رثائی ادب کے علاوہ شاعر، ماہر غالبیات، ماہر انیسیات، دبیریات اور اقبالیات کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔'

'ڈاکٹر سید تقی عابدی: بحیثیت نقاد و محقق' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق ایک اور کتاب ہے جسے رکن الدین نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر تقی عابدی کی ہزاروں صفحات کی تحقیق اور تنقید کو ساڑھے تین سو صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکبر حیدری کشمیری، ڈاکٹر تقی عابدی کے ادبی تعارف میں لکھتے ہیں۔ 'ڈاکٹر صاحب گویا ہر فن مولا ہیں۔ دو تین درجن سے زائد اعلیٰ پائے کی کتابوں کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایک ممتاز ناقد اور باکمال شاعر بھی ہیں۔ تقی تخلص کرتے ہیں۔ انہیں علم عروض، علم معانی و بیان اور فارسی زبان میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ فارسی اس روانی کے ساتھ بولتے ہیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے۔ عربی اور دینی معاملات میں بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے پاس رثائی ادب کا ایک نادر الوجود مطبوعہ اور قلمی نسخوں کا ذخیرہ ہے۔'

خود ڈاکٹر تقی عابدی کا اردو زبان و ادب سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ کے بارے میں کہنا ہے

کہ 'میں ادب کا مریض اور صحت کا طبیب ہوں ۔' ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے اردو ادیب اور شاعر ہیں جو طب کی کمائی کو ادب پر لٹاتے ہیں ۔

والدین نے سید تقی حسن عابدی نام رکھا لیکن انھوں نے قلمی نام سید تقی عابدی اختیار کیا۔ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی تو ڈاکٹر کا سابقہ نام کے ساتھ جڑ گیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور پیدائش کے چار سال بعد بعد والد محترم سید سبط نبی عابدی کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہو گئے ۔تقی عابدی کے اجداد کا تعلق امروہہ، اتر پردیش کے سادات گھرانے سے ہے۔موصوف کے والد جج تھے جن کا تبادلہ دہلی سے حیدر آباد ہوا تھا۔

گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا اور گھر میں کئی اردو کتابیں تھیں ۔اردو کتابوں کے مطالعہ کا شوق وذوق گھر پر ہی لگ گیا تھا اور فرصت کے لمحات میں انھیں مطالعہ کرنا بہت پسند تھا۔ حیدر آباد شہر میں تعلیم حاصل کی اور اسکول میں تعلیم کے دوران وہ شعر کہنے اور شعری محفلوں میں شرکت کرنے لگے تھے ۔شعر گوئی کے بعد انھوں نے مضمون نگاری کی ابتدا کی اور مقامی اخبار 'سیاست' میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔ اس تعلق سے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر تقی عابدی کہتے ہیں ۔'روزنامہ سیاست اور حیدر آباد کے بعض مجلوں میں میرے مضامین کی ابتدا اس عمر میں ہوگئی تھی جسے انگریزی میں Teen Age کہتے ہیں ۔روزنامہ سیاست کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خان اور جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو شہہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے جس کے سبب مذکورہ مضامین میری شناخت بن گئے ۔'

ڈاکٹر تقی عابدی نے میٹرک دارالشفا ہائی اسکول سے اور ایف ایس سی ، سائنس کالج سیف آباد سے کیا۔اس کے بعد ان کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا جہاں سے انھوں نے سنہ 1975ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی ۔اسی جامعہ اور عثمانیہ میڈیکل کالج میں دو سال پہلے میرا داخلہ ایم بی بی ایس، سال اول میں ہوا تھا۔اس وقت ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے نا آشنا تھے۔

ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے گلاسگو یونیورسٹی ، برطانیہ سے امراضیات

(پتھالوجی، Pathology) میں ایم ایس کی ڈگری حاصل کی اور امریکہ کے کالج آف پتھالوجسٹس (American College of Pathologists) کے وہ فیلو (FCAP) بنے اور جب ڈاکٹر تقی عابدی نے کنیڈا کے رائل کالج آف فزیشینس (Royal College of Physicians) کی فلوشپ حاصل کی تو ان کی ڈگریوں میں ایف آر سی پی، (کنیڈا، FRCP (Canada)) کا اضافہ ہوا۔ غرض ان کے نام کے ساتھ پیشہ ورانہ ڈگریوں کا ایک لانبا لاحقہ (M.B;B.S; M.S; FCAP; FRCP) لگا ہوا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ملازمت کے لیے ایران اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ اور امریکہ کا رخ کیا اور مستقل رہائش کے لیے کنیڈا کا انتخاب کیا۔ ملازمت کے سلسلہ میں ایک عرصہ ایران میں رہے۔ ایران میں ڈاکٹر تقی عابدی نے باقاعدہ ایک معلم سے فارسی زبان سیکھی، وہ فارسی کسی اہل زبان کی طرح بولتے ہیں۔ انھیں فارسی شعروادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے فارسی ادب پر بھی کام کیا۔ ایران میں قیام کے دوران ان کی ملاقات محترمہ گیتی صاحبہ سے ہوئی اور تھوڑے عرصہ بعد دونوں کی رضامندی اور بڑوں کی اجازت سے ان کی شادی ہوگئی۔ بیگم تقی عابدی امور خانہ داری میں مصروف رہنے کے ساتھ ان کی ادبی کاوشوں میں معاون و مددگار رہتی ہیں۔ آپ دونوں کی چار اولادیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ گھر کی زبان فارسی ہے لیکن اردو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ایران، برطانیہ اور امریکہ میں رہنے کے بعد وہ کنیڈا میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کنیڈا کے شہر اونٹاریو کے کابروا اسپتال سے بحیثیت فزیشین وابستہ ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر تقی عابدی کا قیام پانچ ملکوں ہندوستان، ایران، برطانیہ، امریکہ اور کنیڈا میں رہا ہے۔

ابتدا میں اخبار سیاست میں مضامین چھپنے کے علاوہ ان کے مضامین نیویارک کے ہفت روزہ 'اردو ٹائمز' میں بالالتزام شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کو لکھنے کا دلچسپ سبب ڈاکٹر تقی عابدی یہ بتاتے ہیں کہ 'دیارِ غربت میں اردو کا چہرہ زرد و بے رنگ نظر آیا تو طلسم قلم سے رنگ بھرنے کی کوشش کی، چنانچہ نیویارک سے شائع ہونے والے معروف و مقبول ہفتہ وار 'اردو ٹائمز' میں مختلف عنوانات پر ادبی مطالب لکھے، تاکہ شمالی امریکہ میں اردو کے شیدائیوں کی کسی حد تک تشفی ہو سکے،

کیوں کہ سیاسی مطالب تو یہاں مل جاتے ہیں لیکن ادبی مضامین کی کمی اور قلت ہے۔' اور یہی جذبہ ان کے دیگر تنقیدی اور تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھنے میں بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ ادب کو چاہنے اور پسند کرنے والوں کی راہنمائی ہو سکے!

ڈاکٹر تقی عابدی کا طبّی اختصاص پیتھالوجی یعنی امراضیات ہے اور نمایاں ادبی میدان تحقیق اور تنقید ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ امراضیات اور تحقیق و تنقید میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ امراضیات میں مرض کی وجوہات اور اثرات دریافت کرنے اور ان کی تفصیلات پر بات ہوتی ہے تو ادبی تحقیق اور تنقید میں کچھ اسی قسم کا ادبی کام کیا جاتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر تقی عابدی جیسا شاید ہی کوئی دوسرا طبّی ماہر ہوگا جس نے تحقیق اور تنقید میں اتنا کام کیا ہے بلکہ ان کا شمار اردو زبان کے صفِ اول کے محققین اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیخ احمد عقیل، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کہتے ہیں۔ 'وہ جس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں اس پر ہر پہلو سے تحقیق کرتے ہیں، پھر لکھنا شروع کرتے ہیں۔ انھوں نے ادب کے کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، ہر موضوع پر قابل قدر کام کیا ہے۔ وہ جس موضوع پر کام کرتے ہیں اس کے ماہر بن جاتے ہیں، یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔ یہ دنیا بھر میں اردو کے سفیر بھی ہیں، جہاں بھی اردو پر بات ہوتی ہے وہاں ان کا کسی نہ کسی حوالے سے تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔'

'ڈاکٹر تقی عابدی، اردو کا نابغہ روزگار عاشق' میں ان کی تحقیق کی ایک دوسری اہم خوبی جمال عباس فہمی یہ بیان کرتے ہیں کہ 'تاریخ کے نہاں خانوں میں پوشیدہ قلمی اور ادبی فن کاروں کو تلاش کر کے انہیں منظر عام پر لا کر ادب میں ان کا جائز مقام و مرتبہ دلانا ان کا پسندیدہ کام ہے۔ اردو ادب کی دنیا نے اگر کسی ادیب اور شاعر کی ناقدری کی اور ناقدین اور ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں نے اردو کے کسی قلم کار کا اس کا جائز مقام و مرتبہ نہیں دیا تو یہ تقی عابدی کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور وہ اس قلم کار کی نگارشات کو منظر عام پر لا کر اسے اس کا جائز مرتبہ دلانے کی کامیاب سعی کرتے ہیں۔ ان کی تصنیف، تدوین اور تالیف کردہ معتدد کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں۔'

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی،

ڈاکٹر تقی عابدی کو 'مہجر ی ادب کا درخشاں ستارہ' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ 'تقی عابدی کا مہجر ی ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ عہد اور معاشرے کے پیش نظر ادب میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں اور ادب کے پرکھنے کے معیار و منہاج میں بھی اسی کے مطابق نظریات اور اصول بنتے رہے ہیں لیکن آج کے عہد میں ادب کی تفہیم و تعبیر کے نظریات اور اصول و ضوابط میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارا معاشرہ بہت سرعت سے تغیر و تبدل کی جانب مائل ہے۔ موجودہ دور میں کسی ادب کی قدر و قیمت اور اس کے ثروت مند ہونے کے جہاں کئی معیارات ہیں وہاں اب ایک اہم معیار یہ قائم ہوگیا ہے کہ جس ادب میں 'مہجر ی ادب' کا سرمایہ جتنا وقیع ہوگا وہ ادب زیادہ ثروت مند تسلیم کیا جائے گا۔ اس کے پیچھے منطق یہ ہے کہ آج کا معاشرہ عالمی گاؤں کا معاشرہ ہے، اس لیے ادب کی وسعت بھی اسی قدر ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ موجودہ منظر نامہ میں تحقیق و تنقید کے اعتبار سے مہجری ادب کا جائزہ لیں تو ان میں روشن ستارے کی طرح تقی عابدی کی شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔۔۔'

نامور شاعر محسن بھوپالی ڈاکٹر تقی عابدی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ 'آپ کے ہاں حافظ اور خسرو سے عقیدت کا انداز ہے وہ انوکھا نرالا نہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ضرور ہے۔ آپ نے ان بلند قامت شعرا کی شاعری کو جس تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا اور پرکھا ہے اس سے آپ کی اردو فارسی کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کی آبرو میر، غالب، انیس اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر آپ کی جو نظر اور اس کے جو مختلف پہلو ہیں انہیں نہایت بصیرت افروز کہا جاسکتا ہے اور انہیں ادب میں خصوصی اضافے کی اہمیت کا حامل بھی گردانا جاسکتا ہے۔' اس مختصر اقتباس سے ڈاکٹر تقی عابدی کے تحقیقی اور تنقیدی کام کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں کہ 'علمی و ادبی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی کی مثال اگر کسی سے دی جاسکتی ہے تو صرف سید تقی عابدی ہی ہیں۔۔۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر

جن پر بہت کم لکھا گیا ہے توجہ دی اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین وتالیف کر کے کئی کتابیں منظر عام پر لائیں جو شاید بہت کم سے ممکن ہوتا ہے۔'

سید تقی عابدی کی کتابوں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ مرزا دبیر پر ہی سات کتابیں (ابواب المصائب تصنیف مرزا دبیر، مصحف فارسی مرزا دبیر (کلام فارسی)، مثنویات دبیر، مجتہد نظم مرزا دبیر، سلکِ سلام دبیر، رباعیات دبیر، وغیرہ) ہیں۔ میر انیس پر لکھی جانے والی کتابوں کی فہرست (جیسے دیوانِ سلام وکلام انیس، دیوان رباعیات انیس، تجزیہ یادگارِ انیس) بھی طویل ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے غالب کے فارسی کلام کو دو جلدوں (کلیاتِ غالب فارسی، جلد اول ودوم) میں جمع کیا۔ بقول تقی عابدی 'غالب کی شاعری کا نامعلوم پہلو یہ ہے کہ فارسی شاعری اپنی ضخامت میں اردو سے زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ غالب دیوان نعت ومنقبت اور دیوان غالب دہلوی بھی مرتب کی ہیں۔

فیض احمد فیض پر ڈاکٹر تقی عابدی جیسا کام (فیض فہمی اور فیض شناسی) کوئی دوسرا شاید ہی کر سکے گا۔ جوش ملیح آبادی، اقبال، انشاء، فراق گورکھپوری، فانی، امجد اور دوسرے کئی مشاہر ادب پر ڈاکٹر تقی عابدی نے کئی کتابیں لکھی ہیں، چند نام گنانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ خان انشاء، اظہارِ حق، کائنات نجم، دردریائے نجف، تعشق لکھنوی، اقبال کے عرفانی زاویے، روپ کنوار کماری، ادبی معجزہ، تاثیر ماتم، طالع مہر۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے دو مجموعہ کلام 'گلشن رویا' اور 'جوش مودت' شائع ہو چکے ہیں اور ایک کتاب 'رموز شاعری' کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے جس میں شاعر تقی عابدی نے آسان زبان اور عام فہم انداز میں فن عروض پر بات کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے چند منتخب اشعار اور ایک شگفتہ پیرائے میں کہی گئی نظم کو پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی صلاحیتوں سے برّصغیر میں خوب استفادہ کیا جاتا ہے۔ وہ سنہ 2011ء سے حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے شعبہ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔ جموں یونیورسٹی اور لکھنو کی خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کے بھی وزیٹنگ

اشعار

ڈاکٹر سید تقی عابدی

کے کلام سے مختصر انتخاب

دیا جلا کے اندھیروں کو ڈھونڈنے نکلے
قدم قدم پہ اجالے نظر میں آنے لگے

☆☆

جو کریں دشمنوں کو شرمندہ
دوست ایسے کہاں نہیں ہوتے

☆☆

عجب دَور ہے یہ کہ لفظوں کے اندر
ادیبوں کے ٹوٹے قلم دیکھتے ہیں

☆☆

احباب آ گئے ہیں تقی دفن کے لیے
کس نے کہا کہ دوست ترے باوفا نہیں

☆☆

ہے شاعری ہی مرا ساز اور مرا پرچم
ہے شاعری ہی مرا زخم اور مرا مرہم

ہے شیشے پہ ان کی نگاہیں بھی لیکن
نہیں دیکھتے وہ، جو ہم دیکھتے ہیں

☆☆

کس کو صدا کروں کہ کوئی ہمنوا نہیں
کس موڑ پر کھڑا ہوں مجھے خود پتہ نہیں

☆☆

تمھارا شہر چھوڑے جا رہے ہیں
مگر چرچے ہمارے نہ ہوں گے

☆☆

خوشبو ہے تری یاد کی ہر وقت مرے ساتھ
ہم پھول کی خوشبو پہ گزارا نہیں کرتے

☆☆

راستہ کون سا ہے جس پہ تقی
رہزنوں کے مکاں نہیں ہوتے

☆☆

جلا کے میرا نشیمن کہا یہ بجلی نے
چمن میں روشنی کچھ کم تھی ہم بڑھانے لگے

پروفیسر ہیں۔ حال میں انھیں شعبہ اردو تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد میں وزیٹنگ پروفیسر بنایا گیا ہے۔
برّصغیر کے کئی سمینار اور سمپوزیم میں انھیں مدعو کیا جاتا ہے اور وہ ان پروگراموں میں حصّہ لینے کے ساتھ کلیدی اور توسیعی خطبات دے چکے ہیں۔ ان کے آن لائن لیکچرس کا بھی انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے۔

'شاعری کی دکان'

مشاعرہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی

جیسا دل چاہے جس کو پڑھا دیجیے
شاعروں کو بلا کر لڑا دیجیے

جب وہ آپس میں دست وگریبان ہوں
ان کو مجبوب کرکے چھڑا دیجیے

فکرِ منصور جن کے سروں میں نہیں
ان بچاروں کو پھانسی لگا دیجیے

داد دیتے رہیں جو فقط آپ کو
ان کو محفل میں آگے بٹھا دیجیے

مطلع سن سن کے متلی سی ہونے لگی
کچھ کھٹائی غزل کی چکھا دیجیے

ناگری خط سے جو دیوقامت ہوئے
ان کو اردو کا انشا لکھا دیجیے

چار اشعار کب تک سنائیں گے آپ
کوئی تازہ غزل بھی سنا دیجیے

ہم تو ہیں ناظمِ بزم کے ہاتھ میں
اب اٹھا دیجیے یا بٹھا دیجیے

ہر مقامی بھی رکھتا ہے اپنا مقام
کیا مقام آپ کا ہے بتا دیجیے

کوئی شاعر بھی ترتیب سے خوش نہیں
رسمِ ترتیب کو اب اٹھا دیجیے

شاعری کی دکاں پر ہے پیرِ مغاں
آیئے کھوٹا سکّہ چلا دیجیے

شاعرِ عصر کو کرکے مہمان گھر
اپنی تعریف میں کچھ سنا دیجیے

دے کے کچھ شعر از راہِ لطف و کرم
ہم نشینوں کو شاعر بنا دیجیے

تبصرہ شاعروں پر کریں جب کبھی
میر و غالب سے آگے بڑھا دیجیے

بزم شاعر تھی جو مرکزِ فن کبھی
اس کو شعراء کا دنگل بنا دیجیے

ماہرینِ عروضی سے پوچھے کوئی
آپ کیوں مستند ہیں بتا دیجیے

بات حق کی ہے کڑوی اگر چہ تقی
حوصلہ کیجیے اور سنا دیجیے ☆

اردو زبان وادب کے مختلف رسالوں اور کتابی سلسلوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت اور ان کے فن اور ان کی ادبی خدمات پر خصوصی گوشے اور نمبر شائع کیے ہیں۔ ان میں ممبئی سے شائع ہونے والا قدیم ادبی رسالہ ’شاعر‘ اور راولپنڈی، پاکستان کا ادبی ماہنامہ ’چہار سو‘ شامل ہیں۔ سرینگر سے شائع ہونے والا مجلّہ ’حکیم الامت‘ نے بھی تقی عابدی کے لیے ایک گوشہ مختص کیا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات پر ہندوستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں آٹھ سے زیادہ ریسرچ اسکالرس نے تحقیقی مقالے (برائے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی) تحریر کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو اردو دنیا کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی جانب سے کئی علمی اور ادبی ایوارڈوں سے نوازا جا چکا ہے۔ دوحہ، قطر کی عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم ’مجلس فروغ اردو ادب‘ نے ڈاکٹر تقی عابدی کو اکیسویں ’عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ 2017ء‘ سے نوازا ہے۔ مختلف ملکوں اور شہروں کے ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی بھی خوب ہوتی ہے۔ ان کے لیے اور ان کے اعزاز میں ادبی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔

اردو زبان کے تعلق سے ڈاکٹر تقی عابدی کے خیالات ہمیں نہ صرف سوچنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ عمل کی راہ متعین کرنے میں بھی معاون ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ’اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔ چونکہ زندہ ہے اس لیے ہر روز اس کے مسائل نئے ہیں۔ اردو زبان کے اس قدر کم عمری میں اتنی بڑی زبان بن جانے کا راز اس کی دوسری زبانوں سے لین دین ہے۔ آج یونیسکو کی شمار بندی کے لحاظ سے یہ دنیا کی چوتھی یا پانچویں بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے لحاظ سے یہ بائیسوں نمبر پر اس لیے ہے کہ ہم اپنی مادری زبان سندھی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، بلوچی یا ملیالم لکھوایا ہوا ہے۔ بہر حال اردو پھیل رہی ہے۔ اب زیادہ تر یہ کانوں کی زبان بن چکی ہے۔ بعض مقامات پر یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی۔ ایسے نازک موقع پر اس کے رسم الخط اور اس کی تہذیب کی حفاظت ہم سب کی ذمّہ داری بنتی ہے۔ جہاں تک سوال اردو کے ادباء شعرا اور ناقدین کے اختلاف رائے کا ہے اس میں کچھ اثر تو ماحول کا اور کچھ جگہ شخصیات اثر انداز ہو رہی ہیں۔ بقول شاعر

اردو کی سرنوشت میں ہے اس لیے نفاق
اردو کے چار حرف ہیں چاروں جدا جدا

ڈاکٹر تقی عابدی کی شہرت ان کی ذاتی لائبریری (جو ٹورانٹو، کنیڈا میں ہے) سے بھی ہے جس میں 1400 مخطوطات اور تیرہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ان کی لائبریری میں اردو کی پہلی صاحبِ دیوان خاتون شاعرہ ماہ لقا چندا دیوی کا سو سال پہلے شائع ہوئے دیوان کی ایک کاپی موجود ہے۔ انھوں نے ان قلمی نسخوں اور مخطوطوں کو کثیر رقم خرچ کر کے جمع کیا ہے۔ اپنی لائبریری کے تعلق سے ڈاکٹر تقی عابدی کہتے ہیں کہ 'یہ لائبریری میں نے خود اپنی ادبی ضروریات کی تکمیل کے لیے بنائی ہے تا کہ مجھے ہر قسم کا ادبی مواد نارتھ امریکہ جیسے ملک میں میسر آ سکے۔۔۔ چوں کہ میرا تعلق تنقید اور تحقیق کے ساتھ بہت گہرا ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے محسوس کیا ہے کہ میرے پاس محفوظ ذخائر مستقبل میں تحقیق و تنقید کے لیے بے حد کارآمد اور مفید رہیں گے، لہذا میری حیات تک ان ذخائر سے میں استفادہ کرتا رہوں گا۔ میرے بعد فوری طور پر یہ علمی اور ادبی ذخائر یونیورسٹی کے علمی ذخائر میں جمع ہو جائیں گے۔'

ڈاکٹر سعید نواز

یادش بخیر! یہ سنہ 1997ء کی بات ہے۔ سعودی عرب کے ریاض شہر میں ہم، ہندوستانی بزم اردو، ریاض کے اراکین سر جوڑے آزادیٔ ہند کے گولڈن جوبلی سال کے موقع پر مشاعرہ منعقد کرنے کے لیے شعرا حضرات کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ہمارے ایک سینئر ساتھی جناب میر احمد علی جنھیں ہم سبھی میر بھائی کہتے ہیں نے یہ کہہ کر ہمیں چونکا دیا کہ وہ ایک پاورفل اور رومانٹک شاعر کا نام پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم حیران کہ ریاض شہر میں کوئی ایسا شاعر بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے! میر بھائی نے وجہ یہ بتلائی کہ وہ ریاض میں نئے نئے وارد ہوئے ہیں اور صرف ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ خیر اس تمہید کے بعد انھوں نے کہا۔ 'ڈاکٹر سعید نواز بڑا غضب کا پوئیٹ ہے۔'

ڈاکٹر اور پوئیٹ کی اضافتوں پر میں پوری دلجمعی کے ساتھ ڈاکٹر سعید نواز میں دلچسپی لینے لگا۔ ان سے ملاقات کی۔ ان میں عام شاعروں جیسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ اصرار کرنے پر بھی انھوں نے اپنا کوئی شعر نہیں سنایا۔ میر بھائی کی پرزور سفارش پر ہم نے ڈاکٹر سعید نواز کو مشاعرہ میں مدعو کیا۔

ریاض شہر کے حیٔ السفارات علاقے میں انڈین ایمبسی آڈیٹوریم میں مشاعرہ منعقد ہوا اور ڈاکٹر سعید نواز نے شرکت کی۔ میر بھائی کی بات سچ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر سعید نواز نے اپنے مخصوص انداز میں نظمیں سنائیں۔ 'کب آؤ گی زرینہ' اور 'کون سا گیت سنوگی انجم' کی دھوم ہوئی۔ ڈاکٹر سعید نواز کو ڈھیروں داد ملی اور انھوں نے بلاشبہ مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ ایک عرصہ تک ریاض شہر میں اردو این

آر آئز سعید نواز کی نظموں کے سحر میں گرفتار رہے۔

ڈاکٹر سعید نواز کنگ خالد یونی ورسٹی ہاسپٹل میں اخصائی تخدیر (انیستھسیا لوجسٹ) کی حیثیت سے برسرِ خدمت تھے۔ اب بھی ہیں اور ممکن ہے کہ دو ایک برسوں میں ریٹائر ہو کر وطن واپس ہوں۔

اردو کی ایک نئی بستی سعودی عرب میں محفلیں منعقد کرنے میں ڈاکٹر سعید نواز کا عملی تعاون حاصل رہا ہے۔ ہم نے انھیں ہندوستانی بزم اردو، ریاض کا ممبر اور عہدیدار بنایا اور وہ بزم کے مختلف پروگراموں میں حصّہ لینے لگے۔ مشاعروں میں ڈاکٹر سعید نواز ہوتے ہی ہیں، انٹرنیشنل انڈین اسکول ریاض کے بچوں کے لیے تقریری مقابلوں میں بھی وہ موجود رہتے ہیں۔ بزم کے دوسرے پروگراموں جیسے جشن شگفتہ دکن، شام قہقہہ وغیرہ میں بھی ڈاکٹر سعید نواز کا تعاون حاصل رہتا ہے۔ سعودی عرب سے میری وطن کو واپسی کے بعد سنا ہے کہ ڈاکٹر سعید نواز ہندوستانی بزم اردو کی جانب سے قائم کیے گئے 'بزم اردو ٹوسٹ ماسٹرز کلب' کے بھی بے حد فعال رکن ہیں۔

چونکہ ڈاکٹر سعید نواز میرے ہم پیشہ ہیں تو میں نے انھیں 'انڈین ڈاکٹرز فورم (آئی ڈی ایف) ریاض' میں شامل ہونے کی دعوت دی جو انھوں قبول کر لی اور اس فورم کے بھی وہ فعال رکن ہیں۔ ریاض، سعودی عرب میں رہنے تک میں آئی ڈی ایف ریاض کا ممبر اور چند برسوں کے لیے صدر بھی تھا۔

ڈاکٹر سعید نواز تلنگانہ ریاست کے ضلع ورنگل میں نومبر 1956ء میں پید ہوئے۔ آپ کے والد محترم عبدالرشید نواز نے اس زمانے میں عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی تھی جب معدودے چند لوگ ہی علم کی اس اعلی وارفع ڈگری تک پہنچ پاتے تھے۔ موصوف کا درس وتدریس سے تعلق تھا اور وہ اسلامیہ ہائی اسکول اور کالج، ورنگل کے پرنسپل تھے۔

ڈاکٹر سعید نواز نے اردو میڈیم سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیم پائی اور ایم بی بی ایس میں داخلہ کے لیے اردو زبان میں انٹرنس ٹسٹ لکھا اور میرٹ کی بنیاد پر آپ کا داخلہ کاکتیہ میڈیکل کالج، ورنگل میں ہوا۔ انھوں نے یہ دلچسپ بات بتلائی کہ اس وقت ایم بی بی ایس میں داخلے

ایمبریالوجی

اک تاج محل جیسے
تعمیر کے درجے سے
تکمیل کی چوکھٹ تک
آخر کو پہنچتا ہے

اک جسم ادھورا سا
بے لفظ و بے معنی،
بے نام دھندلکوں کی
سرحد سے اِدھر آ کر
تخلیق کی سیڑھی پر
ننھا سا قدم رکھ کے
دنیا میں پہنچتا ہے

☆ ☆

کا امتحان اردو میں لکھا جا سکتا تھا اور اردو میڈیم کا معیار تعلیم بلند بھی تھا کہ اردو میڈیم کے طالب علم میرٹ پر اعلیٰ تعلیم میں داخلہ بھی حاصل کرتے تھے۔

ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد سنہ 1985ء میں ڈاکٹر سعید نواز ایران چلے گئے اور وہاں تین سال ملازمت کی۔ تین برس کے مختصر عرصہ میں وہ ایرانی تہذیب اور فارسی زبان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے فارسی زبان سیکھی۔ موصوف اب بھی کئی برسوں بعد مزے لے کر وہاں کے واقعات اور فارسی زبان کی شرینی اور لطافت بیان کرتے ہیں۔

ایران سے خوشگوار یادوں کو سمیٹے وہ واپس ہندوستان آئے اور علم طب کے شعبہ تخدیریات (انیستھسیالوجی) میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی یعنی وہ بے ہوش کرنے والے ماہر ڈاکٹر بنے۔ مہارت حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر سعید نواز حیدرآباد کے ایک نامور دواخانے میں بحیثیت انیستھسیالوجسٹ کام کیا۔ طب کا یہ ماہر شعبہ کتنا مشکل یا پیچیدہ ہوتا ہے اس بات کا اندازہ اس کے نام کی مشکل ادائیگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسم با مسمیٰ یعنی جیسا نام ویسا کام کی طرح یہ شعبہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ آسانی کی خاطر یوں سمجھیے کہ مریض کو موت کے قریب پہنچا کر پھر سے واپس لایا جاتا ہے۔ اس عارضی موت یا بے حسی اور بے ہوشی کے دوران دوسرے ماہرین عموماً جراح حضرات مریض پر انیستھسیالوجسٹ کی اجازت سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے زخموں کا علاج کرتے ہیں، اعضا بدلتے ہیں اور جسم کے بیمار حصّوں کو ٹھیک یا نکال باہر کرتے ہیں۔

شعبہ تخدیریات میں مہارت اور تجربہ حاصل کرنے بعد ڈاکٹر سعید نواز کچھ عرصہ ہی وطن میں رہے اور پھر بیرون ملک کا رخ کیا، اس مرتبہ ان کا رخ فارسی زبان کی بجائے عربی زبان کی طرف

ریل کا سفر اور دو لڑکیاں

میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام
جن کو کرتی ہیں جھک کر بہاریں سلام
جن کے کیلنڈروں میں خزاں ہی نہیں
ان سے پوچھو، بہاروں کے موسم ہیں کب
وہ بتادیں گی بارہ مہینوں کے نام
میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام

میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام
ہائسکول میں جنہوں نے تھی انگلش پڑھی
ہوگئیں لطف اردو سے نا آشنا
شعر کی یہ گرہ سے الجھتی نہیں
میری نظموں کا مطلب سمجھتی نہیں
پھر بھی محسوس کرتی ہیں، جو کچھ ہے یہ
ان کے معصوم چہروں سے منسوب ہے
جانے کیا کچھ لکھا ہے، مگر خوب ہے
اس میں جو کچھ بھی ان کا اپنا ہے یہ
اک جواں سال شاعر نے دیکھا جسے
اس کی راتوں کا رنگین سپنا ہے یہ
حسن فطرت کے خفیہ دفینوں کے نام
خوبصورت، کنواری، حسینوں کے نام
میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام

میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام
جن میں شامل ہیں دو اجنبی لڑکیاں
ان کے نام کیا تھے میں نہیں جانتا
ریل کے اک سفر میں ملیں تھیں مجھے
اور مقابل کے سیٹوں پر بیٹھی ہوئی
کررہی تھیں وہ آپس میں سرگوشیاں
ان میں بائیں طرف جو تھی بیٹھی ہوئی
اس کی آنکھیں تو گویا کہ پیمانہ تھیں
اور میں اس کی آنکھیں بچاتے ہوئے
پی گیا اس کی آنکھوں کی مدہوشیاں
اور منزل جب آئی تو ایسے لگا
میرا دل راستے میں کہیں رہ گیا
ریل گاڑی سے اتریں وہ دو لڑکیاں
منتظر ایک موٹر تھی ان کی وہاں
پھر تو موٹر وہ دو لڑکیاں کھاگئیں
اور موٹر کو جیسے سڑک پی گئی
ہوگئیں وہ جدا، کیا غضب ہے خدا
پاس گھنٹوں تلک جو تھی بیٹھی ہوئی
آن کی آن میں ہوگئیں گم شدہ
گم شدہ، اجنبی، ہم نشینوں کے نام
بادلوں میں چھپی مہ جبینوں کے نام
میری نظمیں ہیں ان نازنینوں کے نام

☆ ☆ ☆

کب آؤگی!

مکڑی نے جوتنی ہیں زنجیریں دیکھتی ہو
دیوار پہ جنون کی تصویریں دیکھتی ہو
یہ عورتوں کی ننگی تصویریں دیکھتی ہو
کمرہ مرا یہ کیا ہے طوفان کا سلسلہ ہے
طوفان بدتمیزی، طوفان بدحواسی
ہر شئے پہ رنگ حسرت، ہر شئے پہ ہے اداسی
کب رنگ آس بن کر، ساحل کی پیاس بن کر
کمرے کی اس فضاء پر تم چھاؤ گی زرینہ
کب آؤ گی زرینہ

سگریٹ ایک جلا کر چپ چاپ سر جھکا کر
میں سوچتا ہوں اکثر اور پوچھتا ہوں خود سے
اس وقت جو زرینہ ہوتی یہیں کہیں جو
کیا بولتی وہ مجھ سے
اتنے زیادہ سگریٹ مت پیجئے گا صاحب
دل کو مرے جلا کر کیا کیجیے گا صاحب
اب نا پیئے یہاں سے رستہ وہی پرانا
اب اسپتال سیدھے ہو جایئے روانہ
اور اسپتال سے جب گھر لوٹ آیئے گا
سوپر بازار سے کچھ لیتے بھی آیئے گا

تم چیز ایک مانگو، چیزیں ہزار لا دوں
تم گل جو ایک مانگو، ساری بہار لا دوں
گل کا نکھار صدقے، مئے کا خمار صدقے
تیری بس اک ادا پر سوپر بازار صدقے
سوپر بازار سے میں لاؤں گا ایسی ساری
ساری کہ جس کا پلو ہو کہکشاں پہ بھاری
ایسی پہن کے ساری آنگن میں کب مرے تم
اتراؤ گی زرینہ
کب آؤ گی زرینہ

سگریٹ کبھی ختم ہیں، ماچس کبھی ندارد
اور ایش ٹرے کو دیکھو کب سے بھرا پڑا ہے
ایسڈ سے جل گیا تھا، نیلے بشرٹ کا دامن
اس روز سے وہ یوں ہی وارڈ وب میں پڑا ہے
درزی کو دے کے آوں فرصت نہیں ہے مجھ کو
ایسے گھریلو پن سے فرصت نہیں ہے مجھ کو
بستر کو میرے دیکھو کتنی ضخیم جلدیں
بکھری ہوئی پڑی ہیں
ان سب کو کب اٹھا کے، بک شیلف میں جما کے
بستر پہ اپنی زلفیں بکھراؤ گی زرینہ
کب آؤ گی زرینہ

کب آؤگی! (جاری)

گردش میں میکدہ کا اک جام ہو رہا ہوں
کالج کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
آجاؤ تم جو سیکھوں جینے کا کچھ طریقہ
گھر کو سجا کے رکھنے کا آئے گا سلیقہ
تم آگئیں اگر جو میں سوچنے لگا ہوں
سب دوستوں کی صحبت کو چھوڑ چھاڑ کے اب
آوارگی کے رشتوں کو توڑ تاڑ کے اب
اجلی صبح کی مانند اک زندگی گزاروں
جس میں غمِ ہجر کی باریکیاں نہ ہوں گی
جس میں گناہ شب کی تاریکیاں نہ ہوں گی
بستی کے بیچ ہوگا اک شاندار بنگلہ
کمپاؤنڈ وال ہوگی لکڑی کا پست جنگلہ
شیشے کی کھڑکیوں پر پردے پڑے رہیں گے
اقبال کے قطعوں کے طغرے جڑے رہیں گے
کب سے اداسیوں کے سائے میں پل رہا ہوں
کب سے تمھارے غم کی آتش میں جل رہا ہوں
اس دن کو تک رہا ہوں
جس روز تم بنفشی آنچل کی بدلیوں سے
چہرے کی چاندنی کو
میرے اندھیرے گھر میں بکھراؤ گی زرینہ
کب آؤ گی زرینہ!

☆☆☆

تھا۔ شاید اس خیال سے کہ اردو زبان پر موصوف کی مہارت مکمل ہو سکے۔ سعودی عرب میں آپ کا تقرر شہر ریاض کے مستشفی الملک الخالد، جامعۃ الملک السعود میں بحیثیت استشاری طبیب التخدیر ہوا یعنی وہ شعبہ انیستھسیا لوجی میں مشیر بنائے گئے۔

سعودی عرب پہنچنے کے بعد اکثر لوگ پٹرو ڈالر کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اور مزید تعلیم حاصل کرنا تقریباً ترک کر دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر سعید نواز نے یہاں ریگ زاروں میں بھی حصول علم اور تحقیق و جستجو کو نہیں چھوڑا، پچیس سے زائد تحقیقی مقالے لکھ ڈالے۔ سمیناروں اور کانفرنسوں میں حصّہ لیا اور اپنے تجربات اور مشاہدات کو پیش بھی کیا۔ آگے اور اعلیٰ تعلیم بھی جاری رکھی اور عرب بورڈ کی فیلوشپ حاصل کی۔ عرب بورڈ کی فیلوشپ حاصل کرنا ڈاکٹر سعید نواز کی انفرادیت شمار ہوگی کہ بہت کم ایشیائی باشندے اس ڈگری کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید نواز نے جہاں محنت کر کے علم طب کے شعبہ تخدیریات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں وہیں قدرت ان پر مہربان

بھی رہی ہے۔انھیں بچپن ہی سے شعرفہمی اور شعر گوئی کی صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔آپ کے والد ایک نعت گو شاعر تھے اور خاندان میں دوسرے افراد بھی شاعری سے شغف رکھتے اور شعر کہتے بھی ہیں۔آپ کے پھوپی زاد بھائی ڈاکٹر عزیز احمد عرسی جنھوں نے حیاتیات (زوالوجی) میں پی ایچ ڈی کیا ہے شاعری کرتے ہیں اور سائنسی موضوعات پر مضامین لکھتے ہیں جو ملک کے مختلف اخبار اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ڈاکٹر عرسی کی شاعری، سائنس، مذہب اور عام معلومات کی کئی کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔

ڈاکٹر سعید نواز نے پہلی نظم اس وقت کہی تھی جب وہ پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے۔ جماعت میں ماسٹر صاحب ایک انگریزی نظم پڑھا رہے تھے اور موصوف کلاس ختم ہونے تک اس نظم کے مرکزی خیال کو اردو میں شعر بند کر کے نظم مکمل کر ڈالی۔

ڈاکٹر سعید نواز اپنی شاعری کے سفر جو میرے خیال میں بہت مختصر اور جس کی غیر طبعی موت ہوئی ہے کے بارے میں کہتے ہیں۔ 'عنفوان شباب کے زمانے میں بہت سی نظمیں لکھیں۔سب نظمیں رواں، رومانی اور ہلکی پھلکی تھیں۔ان میں کچھ نظمیں رسالہ شمع، نئی دہلی میں چھپ چکی ہیں۔مشاعروں میں پڑھی جا چکی ہیں اور مقبول بھی ہوئی ہیں۔دھیرے دھیرے تغیرات زمانے کے ساتھ شمع رسالہ بند ہوگیا اور میری شاعری کے سوتے بھی خشک ہوگئے۔شعر گوئی کے زمانے میں جان نثار اختر، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی اور اسرار الحق مجاز سے بہت متاثر تھا۔ میں شعروں اور نظموں میں ان کا سا رنگ لانے کی کوشش کرتا اور میرے والد محترم نے محسوس کیا کہ شاعری کے ساتھ ساتھ طرز زندگی میں بھی ان کا سا رنگ چھا رہا ہے۔بقول خود

گو مری زندگی میں نظم نہیں
میری نظموں میں زندگی ہے بہت'

نوجوانی کے زمانے میں ڈاکٹر سعید نواز کی شاعری سے رغبت، شاعروں کی صحبت اور شعر گوئی میں مشغولیت سے ان کے والد محترم کو فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے ڈاکٹر سعید نواز کو شعر نہ کہنے

اور مشاعرے نہ پڑھنے کی ایک نہیں کئی مرتبہ تاکید کی۔ والد محترم کی ہدایت تھی کہ وہ پڑھائی پر توجہ دیں۔ ڈاکٹر سعید نواز اپنے والد کی نصیحت پر عمل پیرا ہوئے اور اب وہ شعر نہیں کہتے۔ لیکن ان کے پاس اب بھی ماضی میں کہا گیا کلام حافظہ اور شاید کاغذوں میں بھی محفوظ ہے۔

آج بھی جب وہ اپنا کلام سناتے ہیں تو لطف آجاتا ہے اور سرور سا چھا جاتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی زمانے میں کہی گئی ان کی شاعری آج بھی اثر رکھتی ہے۔ ذہن کے کسی گوشے میں خیال آتا ہے کہ اگر وہ شعر کہتے رہتے تو شاید ایک بڑے رومانی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے لیکن میری نظر میں ان کی قدر و منزلت ایک فرمابردار بیٹے کی حیثیت، ایک شاعر سے کہیں زیادہ ہے۔

ڈاکٹر سعید نواز سے بس اتنی درخواست ہے کہ وہ اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی غرض سے شائع کروائیں اور جب پیشہ ورانہ زندگی سے سبکدوش ہوں تو پرانے شوق کو جلا بخشنے کے بارے میں غور کریں کہ وقت گزاری کے لیے کچھ مشغلہ تو چاہیے۔

ڈاکٹر عابد معز

عثمانیہ میڈیکل کالج، جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کردینے کے ربع صدی سے کچھ زیادہ عرصہ بعد میں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور میں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں حسبِ مقدور حصّہ بھی لیا ہے تو قاعدے سے اس کتاب میں میرے متعلق مضمون کے لیے بھی جگہ بنتی ہے۔ ذہن میں سوال آیا کہ یہ مضمون کون لکھے؟ کسی ساتھی ادیب کو مواد دے کر اپنے بارے میں لکھنے کے لیے کہا جائے یا خود اپنے منہ میاں مٹھو بنا جائے۔ بہت سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ حتی الامکان خودستائی سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے متعلق بقلم خود مضمون لکھ ڈالوں۔

میں اپنے بارے میں اور اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق بتانا چاہوں گا کہ میرے آباواجداد کا تعلق ضلع محبوب نگر، تلنگانہ کے ایک مشائخ خاندان سے ہے اور میری پیدائش 25 جنوری 1955ء کو محبوب نگر کے سرکاری دواخانے میں ہوئی۔ صرف میری پیدائش محبوب نگر میں ہوئی لیکن بعد کے تمام مراحل شہر حیدرآباد میں طے پائے جہاں میرے والد محترم سید خواجہ قطب الدین صاحب مرحوم ومغفور جامعہ عثمانیہ میں طبعیات کے ریڈر اور صدر شعبہ طبعیات، سائنس کالج، سیف آباد تھے۔

خاندان والوں نے میرا نام سید خواجہ معز الدین رکھا اور عابد کو عرفیت کے طور پر پسند کیا تھا۔ جب میں نے ادبی مضامین لکھنا شروع کیا تو عابد معز کا قلمی نام رکھ لیا۔ اب میں 'عابد معز' کے نام سے ہی زیادہ جانا اور پہچانا جاتا ہوں۔ سائنسی مضامین اور کتابوں پر نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ

استعمال کرتا ہوں جبکہ ادبی کتابوں میں قلمی نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ لگانا میں پسند نہیں کرتا۔

میں نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے پرانے شہر کے ایک قدیم اسکول 'مفیدالانام ہائی اسکول' (دسویں جماعت) اور 'انوارالعلوم کالج' (انٹرمیڈیٹ) میں حاصل کی اور میری دینی تعلیم محلّہ کی مسجد کے صباحیہ مدرسہ میں ہوئی ہے۔ گوکہ اسکول اور کالج کے اردو نام ہیں لیکن یہاں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔

اسکول میں مادری زبان اردو کو ایک ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھا اور سیکھا۔ اردو کے استاد محترم احمد مکّی صاحب مرحوم کے پڑھانے کا انداز اور طریقے سے میں اردو زبان کی خوبیوں سے آشکار ہوا اور اپنی مادری زبان وادب سے محبت کر بیٹھا جو آگے چل کر جنون کی کیفیت اختیار کر گئی۔ ماضی میں علیحدہ ریاست تلنگانہ کے قیام کے لیے 70-1969ء کے دوران ناکام احتجاج ہوا تھا جس کے سبب کچھ کم ایک سال تعلیمی ادارے بند رہے۔ میں نے اس وقت کو غنیمت جانا اور اردو زبان وادب کے مطالعہ میں صرف کیا۔

میری تعلیمی حالت اچھی تھی اور میں میٹرک کے امتحان میں اسکول ٹاپر تھا۔ مجھے میڈیکل انٹرنس ٹسٹ میں عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخلہ ملا جہاں سے میں نے سنہ 1979ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کی اور سنہ 1985ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن (این آئی این) اور جامعہ عثمانیہ کی میڈیکل فیکلٹی سے تغذیہ میں پوسٹ گریجویٹ (ایم ایس سی، تغذیہ) ڈگری حاصل کی۔

میری پیشہ ورانہ زندگی بحیثیت ایک ڈاکٹر (طبیب) اور ماہر تغذیہ (Medical Nutritionist) نہایت کامیاب رہی ہے۔ حصول تعلیم کے بعد خانگی پریکٹس اور سرکاری ملازمت کی۔ حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ صحت وطبابت میں سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے پانچ سال (1982ء سے 1987ء) تک پہلے جیل (محابس) اور پھر عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے کلینکس میں خدمات انجام دیں۔ میرا یہ خاصی مصروفیت کا دور تھا۔ صبح سرکاری دواخانہ میں ڈیوٹی اور شام میں اپنا مطب کیا کرتا تھا۔ پیشہ ورانہ مصروفیت کے اس دور میں بھی میری اردو زبان وادب سے دلچسپی نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

میں اپریل 1987ء میں سعودی عرب روانہ ہوا جہاں میرا تقرر وزارتِ صحت، حکومت سعودی عرب ، ریاض میں بحیثیت اخصائی طبیب تغذیہ (Medical Nutrition Specialist)عمل میں آیا تھا۔ میں ریاض شہر میں کچھ کم ربع صدی مقیم رہا اور اگست 2010ء تک کام کیا، پھر استعفیٰ دے کر حیدرآباد واپس ہوا۔ یوں میری پیشہ ورانہ، علمی اور ادبی زندگی کا ایک بڑا حصہ (تقریباً ربع صدی) وطن سے باہر اردو کی ایک نئی بستی ریاض، سعودی عرب میں گزرا۔

سعودی عرب کی وزارت صحت کے ادارۂ تغذیہ میں مجھے اپنے اختصاص تغذیہ اور استحالی امراض (Nutrition & Metabolic Diseases) میں کام کرنے کا موقع ملا۔ کام کی نوعیت ڈاکٹروں کی عام ڈگر سے مختلف تھی۔ انتظامی امور کی نگرانی اور مختلف اداروں کی غذائی خدمات کو بہتر بنانا میرے فرائض میں شامل تھا۔ مریضوں کی راہنمائی کے لیے مختلف قسم کا مواد تیار کرنا بھی ہوتا تھا۔ سمینار اور سمپوزیم منعقد کیے اور ان میں حصہ بھی لیا۔ تحقیق بھی کی، میرے تحریر کردہ چند تحقیقی مقالے (Original Papers) طبی رسائل میں شائع ہوئے۔ ادارہ تغذیہ کے مجلّہ 'التغذیہ والصحہ' (Nutrition and Health) کے انگریزی حصّہ کا میں ایڈیٹر بھی رہا۔ کام کے اوقات صبح ساڑھے سات بجے سے سہ پہر ساڑھے تین بجے تک تھے اور ہفتہ میں دو دن (جمعرات اور جمعہ) چھٹی ملتی تھی۔ خاصہ فاضل وقت میرے پاس ہوتا تھا۔ خیال کیا کہ اللہ کا یہ کرم اپنوں اور اپنی زبان کی خدمت کے لیے ملا ہے، سو میں نے اپنا زیادہ تر وقت اردو کی ترقی و ترویج اور فروغ میں صرف کیا۔

وطن واپس ہونے کے بعد سے میں دواخانوں اور مریضوں یعنی میڈیکل پریکٹس سے دور ہوں لیکن اپنے پیشہ ورانہ ذمّہ داریوں اور فرض سے غافل نہیں ہوں۔ اب بھی میں اپنے پیشہ سے اس حیثیت سے جڑا ہوا ہوں کہ اردو زبان میں صحت، طب اور تغذیہ سے متعلق مضامین، کالم اور کتابیں لکھتا رہتا ہوں۔

اردو زبان و ادب اور پیشہ طب سے میری وابستگی اور دل بستگی کو احباب مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ محترم دوست، ملکِ شام کے ہندوستانی سفیر ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔ 'ادب اور طب سے عابد معز کی وابستگی اتنی معتبر ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے یہاں

ادب پر طب یا طب پر ادب کو سبقت ہے۔' میری بیشتر کتابوں کے پبلیشر سید عبدالباسط شکیل کے خیال میں 'عابد معز پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تو مزاج کے لحاظ سے مزاح نگار ہیں۔' کسی نے تشخیص کی کہ عابد معز ہیں تو طب کے ڈاکٹر لیکن اردو زبان و ادب کے مریض ہیں۔ کسی نے کہا کہ میں ٹو ان وَن، ادیب اور طبیب ہوں۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد نے دلچسپ بات کہی کہ 'عابد معز طب کے رفیق اور ادب کے رقیب ہیں۔' مجھے سبھی کی آرا سے اتفاق ہے جبکہ خود کے بارے میں میری رائے ہے کہ میں پیشہ سے طبیب اور شوق سے ادیب ہوں اور میری شخصیت میں طب اور ادب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

احباب کو علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے میری شخصیت میں دو اہم پہلو خالص ادب (طنز و مزاح نگاری) اور معلوماتی ادب (طب، صحت اور تغذیہ، سائنس نگاری) بڑے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ میں اپنے ادبی سفر اور روداد کو انہی دو حصّوں میں بیان کرنا چاہوں گا۔

میرا کوئی خاندانی ادبی پس منظر نہیں ہے، میرے قریبی رشتہ داروں میں کوئی ادیب یا شاعر نہیں ہے۔ میں خاندان کا تنہا بندہ ہوں جس کا ادب سے تعلق ہے۔ اسکول کے دوران ہی سے میں اردو میں مضامین لکھنے لگا تھا لیکن دلچسپ بات یہ رہی کہ میں نے شاعری نہیں کی۔ فطری میلان طنز و مزاح کی جانب تھا اور میرا پہلا فکاہیہ 'لائبریری کی سیر' حیدرآباد کے ایک روزنامہ 'رہنمائے دکن' کے نوجوانوں کے صفحہ پر سنہ 1977ء میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس صفحہ کے مرتب مسیح انجم صاحب سے ملاقات کی۔ وہ خوش ہوئے۔ میری پیٹھ تھپتھپائی اور میرا تعارف ارباب زندہ دلان حیدرآباد اور اس کے ترجمان ماہنامہ شگوفہ سے کروایا۔ میں سنہ 1981ء سے ماہنامہ شگوفہ میں چھپنے لگا اور جلد ہی میں نے شہر حیدرآباد پر مضامین کا مستقل سلسلہ 'مرا شہر لوگاں سوں معمور کر' شروع کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں مدیر شگوفہ، مجلس ادارت اور زندہ دلان کے اراکین کے قریب ہوگیا۔ روزانہ کی ملاقاتوں نے میرے شوق کو جلا بخشی اور میں طنز و مزاح لکھنے کے ساتھ اس کے فروغ میں بھی مستعدی سے حصّہ لینے لگا۔ اپریل 1987ء میں سعودی عرب روانہ ہونے کے موقع پر بیچلر کوارٹرس کے ٹیرس پر احباب نے اس وقت کے صدر جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں ایک وداعی

تقریب رکھی۔ میری گل پوشی کی گئی اور کہا گیا کہ زندہ دلان حیدرآباد کا سفیر اور شگوفہ کا نمائندہ بیرون ملک جارہا ہے اور یہ شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد کے لیے خوش آئند بات ہے۔

سعودی عرب میں مجھے نیا ماحول میسّر آیا۔ نئے دوست بنے۔ پاکستانی رسائل پڑھنے کو ملے اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا بھی موقع ملا۔ ماہنامہ رابطہ، افکار، چہارسو، اردو ڈائجسٹ وغیرہ میں میرے فکاہیہ شائع ہوئے۔ ماہنامہ 'رابطہ' مجھے بہت پسند آیا۔ اس رسالے میں میرے خاصے مضامین شائع ہوئے لیکن شومیٔ قسمت یہ رسالہ بیس ایک برس چھپنے کے بعد بند ہوگیا۔

سعودی عرب میں میرا قیام جسے میں وہاں کا 'اردو کا سنہرا دور' کہتا ہوں میں رہا۔ عرب دنیا کا پہلا اردو روزنامہ (اردو نیوز 7 مئی 1994ء سے 22 مارچ 2019ء) اور پہلا اردو ہفت روزہ (اردو میگزین مارچ 1999ء سے اکٹوبر 2009ء، جملہ 555 شمارے) شائع ہوئے اور بند بھی ہوگئے۔ مملکت کے چھوٹے بڑے شہروں میں اردو محافل اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور سفارت خانہ ہند بھی سالانہ مشاعرہ کروایا کرتا تھا۔ میرے کئی فکاہیہ، صحت، طب، تغذیہ اور ادبی، سماجی اور معاشرتی مضامین اردو نیوز اخبار میں چھپ چکے ہیں اور اردو میگزین میں کالم (فکاہیہ اور بات سے بات) کے لیے ایک صفحہ مختص تھا۔ اردو میگزین کے علاوہ میں روزنامہ 'اعتماد' حیدرآباد، میں بھی 'پھر چھڑی بات' کے عنوان سے کوئی دوڈھائی برس کالم نگاری کرتا رہا۔

اردو نیوز، اردو میگزین اور رابطہ جن میں میں پابندی سے لکھا اور چھپا کرتا تھا، یکے بعد دیگرے بند ہوئے۔ اتفاق دیکھیے کہ اردو میگزین بند ہونے کے چند مہینوں بعد میں نے اچھی بھلی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور وطن واپس چلا آیا۔ واپس ہونے کے بعد میں نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ اپنے پیشہ طب جس کی میں اب تک روٹی کھاتا اور روزی کماتا رہا اور جس کی کمائی ادب پر خرچ کرتا رہا اس سے دوری اختیار کی اور خود کو اردو زبان اور طنز و مزاح کی خدمت میں مصروف رکھنے کا ارادہ کیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اردو والوں کا باہم دست و گریباں والا ماحول میرے لیے نہیں ہے۔ مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔ شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد سے برسوں پرانا تعلق ختم ہوا بلکہ میں کہوں گا کہ تعلق زبردستی ختم کردیا گیا اور حالات ایسے بنائے گئے کہ مجھے اپنی محبوب صنف طنز و مزاح سے بھی دور

ہونا پڑا۔

اب پچھلی ایک دہائی سے میں طنز ومزاح نگاری سے دور اور سائنس نگاری سے قریب ہوں۔اس بنا پر میں خود کو سابق یا ریٹائرڈ بلکہ Retired Hurt طنز ومزاح نگار گردانتا ہوں۔ایسا میں اس لیے کہتا ہوں کہ سعودی عرب سے واپس ہونے کے بعد سے احباب کے رویوں سے نالاں ہو کر میں نے اس صنف ادب میں باقاعدہ مضمون اور کالم نگاری نہیں کی ہے۔

میں طنز ومزاح کو اسلوب یعنی طرز تحریر مانتا ہوں جس کی مدد سے میں نے شگفتہ افسانے لکھے، انشایئے تحریر کیے اور موضوعاتی مضامین لکھنے کے علاوہ کالم نگاری بھی کی ہے۔طنز ومزاحیہ مضامین کا میرا پہلا مجموعہ 'واہ حیدرآباد' سنہ 1994ء میں شائع ہوا تھا۔شہر حیدرآباد پر لکھے گئے مضامین کا یہ انتخاب تھا۔شگفتہ افسانوں کا پہلا مجموعہ 'عرض کیا ہے' اگست 2011ء میں شائع ہوا جو مقبول ہونے اور پسند کیے جانے کے ساتھ جلد ختم بھی ہو گیا تو اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جنوری 2014ء میں شائع کرنا پڑا۔'عرض کیا ہے' کے بعد شگفتہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'یہ نہ تھی ہماری قسمت' شائع ہوا۔

اردو زبان وادب سے متعلق مضامین اور کالموں کو الگ کر کے 'اردو ہے جس کا نام' کتاب شائع کر لی۔انشائیوں کا ایک مجموعہ 'فارغ البال' کے عنوان سے چھپا۔'ہنسی، طنز ومزاح اور ڈاکٹر' کے عنوان سے ایک کتاب سنہ 2021ء میں شائع ہوئی ہے جس کے پہلے حصّہ میں طنز ومزاح کی طبی اہمیت اور افادیت سے متعلق میرے کالم اور مضامین شامل ہیں اور دوسرے حصّہ میں ڈاکٹر طنز ومزاح نگاروں کی نمائندہ تخلیقات دی گئی ہیں۔ان کتابوں علاوہ کالموں کے پانچ مجموعے- بات سے بات، پھر چھڑی بات، اتنی سی بات، وہاں کی بات اور آئی گئی بات -بھی شائع ہوئے ہیں۔اس طرح اب تک طنز ومزاح کی میری گیارہ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔تین کتابوں عرض کیا ہے، یہ نہ تھی ہماری قسمت اور فارغ البال کے پاکستانی ایڈیشن بھی سنہ 2018ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

میری شخصیت وفن اور علمی وادبی خدمات پر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ایم فل (ڈاکٹر عابد معز بحثیت طنز ومزاح نگار از صادقہ سلطانہ) اور پی ایچ ڈی (عابد معز کی علمی اور ادبی خدمات از محمد ماجد میاں) کے مقالے لکھے گئے اور ڈگریاں بھی نوازی گئی ہیں۔

ماہنامہ شگوفہ نے نومبر 2008ء میں 'عابد معز نمبر' اور ماہنامہ 'شاعر' نے جنوری فروری 2017ء میں گوشہ عابد معز شائع کیا۔حقانی القاسمی کی زیر ادارت کتابی سلسلہ 'اندازِ بیان' کا تیسرا شمارہ میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے جو سنہ 2020ء میں شائع ہوا،اس میں باب عابد معز شامل ہے۔ رفیق جعفر نے 'عابد معز کی ادبی شناخت' نامی کتاب مرتب کی ہے جس میں ان کے طویل مقدمہ کے ساتھ دوسرے ادیبوں اور نقادوں کی تحریروں کے اقتباسات شامل ہیں۔

طنز ومزاح لکھنے اور طنز ومزاح کو فروغ دینے کا میرا یہ دور تیس برسوں (سنہ 1980ء سے سنہ 2010ء تک) پر محیط ہے۔ اس دوران میں نے طنز ومزاح کے میدان میں بہت لکھا، چھپا اور ڈائجسٹ بھی ہوا۔ ماہنامہ شگوفہ کی ادارتی ٹیم میں شامل رہا، اس رسالہ کی توسیع اور مستقل اشاعت کا سبب بھی بنا اور زندہ دلوں کے ساتھ طنز ومزاح کے فروغ میں پیش پیش بھی رہا۔ طنز ومزاح کے حوالے سے میری خدمات کو رفیق جعفر نے یوں سمیٹا ہے کہ 'عابد معز کا نام وطن عزیز سے زیادہ غیر ممالک میں جانا مانا جاتا رہا ہے۔ ان کے لکھے اخباری کالم عالم گیر سطح پر اہمیت اختیار کر گئے اور طنز ومزاحیہ مضامین رسائل وجرائد میں شائع ہو کر مقبول عام ہوئے۔ ہندوستان میں ان کی تحریریں نسبتاً کم شائع ہوئیں لیکن ماہنامہ شگوفہ سے یہ ہمیشہ جڑے رہے۔ اس میں ان کی تحریریں بھی چھپتی تھیں اور یہ اٹھارہ برسوں سے زیادہ عرصہ تک ایڈیٹر اوورسیز کی حیثیت سے اعزازی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ وطن واپسی کے بعد یہ اس رسالے کے تقریباً ایک برس تک معاون ایڈیٹر بھی رہے لیکن جلد ہی شگوفہ سے یہ قدیم سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جس پر بات کرنا بے محل ہوگا۔'

ریاض، سعودی عرب میں ہم چند اردو داں احباب نے مل کر اردو زبان کے فروغ اور ترقی اور ترویج کے لیے ایک انجمن 'ہندوستانی بزمِ اردو، ریاض' سنہ 1995ء میں بنائی تھی۔ اس بزم کا میں بانی نائب صدر تھا۔ اس بزم کے تحت اردو کے فروغ کے لیے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے گئے جن میں سب سے اہم ریاض شہر میں ہندوستانی اسکولوں میں اردو کے تقریری، تحریری اور نظم خوانی کے مقابلے منعقد کرنا ہے۔ اردو رسالوں کی توسیع اشاعت کے اقدامات اور اعانت بھی کی جاتی ہے۔ استقبالیہ اور وداعی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ مشاعرے اور ادبی محفلیں جیسے اردو کی دیگر تنظیمیں منعقد

کرتی ہیں ہندوستانی بزم اردو کے زیرِ اہتمام بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام سعودی عرب میں سنہ 2004ء میں شاندار سہ روزہ 'جشنِ شگفتہ دکن' کا ریاض اور جدّہ میں انعقاد عمل آیا تھا۔ بزم کے مختلف پروگراموں کی رپورٹس سعودی عرب کے اردو جرائد اردو اور انگریزی جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ بانی اراکین کی اکثریت کی واپسی کے بعد بھی یہ بزم ریاض میں آج بھی فعال ہے اور اردو محافل کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔

اردو زبان سے میری وابستگی کا دوسرا پہلو 'سائنس نگاری' کے ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ طب کی تعلیم اور ابتدائی پریکٹس کے دوران مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اردو والوں میں صحت، طب اور تغذیہ سے متعلق معلومات کی کمی ہے۔ اس لیے ہم زبان لوگوں میں معلومات کو فروغ دینے کے لیے میں نے طبی یا معلوماتی مضامین لکھنا شروع کیا جو ریڈیو پر نشر ہونے کے علاوہ جرائد میں شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔ میرا پہلا مضمون 'غذا اور طبّی اصول' تھا جو روزنامہ 'سیاست' میں فروری 1980ء میں چھپا تھا۔ صحت، طب اور تغذیہ کے متعلق مضامین کے علاوہ میں نے طبی کالم اور مختصر معلومات کے سلسلے بھی تحریر کیے جو روزنامہ 'منصف' (صحت وطب)، روزنامہ اعتماد (شکرریزے اور غذائیات) اور ماہنامہ سائنس (وزن کے مسائل) میں چھپتے رہے ہیں۔ مضامین، کالم اور کتابیں لکھنے کے علاوہ میں نے ریاض، جدّہ اور حیدرآباد میں صحت اور تغذیہ کے مختلف موضوعات پر عوامی لیکچرس اور انٹرویوز بھی دیے ہیں۔

صحت عامہ اور تغذیہ کے موضوعات پر اب تک اردو زبان میں میری پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ (تیسرا ایڈیشن)، چکنائی اور ہماری صحت (دوسرا ایڈیشن)، کولیسٹرال کم کیجیے، رمضان اور ہماری صحت، حج و عمرہ اور ہماری صحت (دوسرا ایڈیشن)، فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس (دوسرا ایڈیشن)، تول ناپ کر صحت مند رہیے، عام طبی معائنے، موٹاپا ہماری صحت کا دشمن، ہماری غذا میں حیاتین اور معدنیات، بلڈ پریشر نارمل رکھیے، اردو میں سائنسی وسائل اور توضیحی فرہنگ (غذا اور تغذیہ) اور انگریزی زبان میں ایک کتاب Ramadan & Our Health چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔

کتابیں تحریر اور ترتیب دینے کے علاوہ میں نے غذا اور تغذیہ کے مختلف موضوعات پر مختصر کتابچے لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ مئی 2017ء تک آٹھ کتابچے - **نمک** کا استعمال کم کریں، **ترکاری اور پھل** زیادہ کھائیں، **پکوان کا تیل** مقدار اور انتخاب، **شکر** کم کھائیں، **پانی** صحت اور زندگی کی ضرورت، **ذیابیطس** کو شکست دیجیے، **بخار** مرض نہیں ایک علامت، **کھانے** میں ہماری صحت ہے - منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کتابچوں کی بھی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اول الذکر چار کتابچوں کی بارِ دوم اشاعت عمل میں لائی گئی ہے۔

معلوماتی ادب میں میری اس حقیر خدمت سے متعلق سینئر صحافی رشید انصاری کی یہ دوٹوک رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ 'مختلف سائنسی علوم وفنون پر ترجمہ، تالیف وتصنیف منتقل کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے اور مجبور و بے بس بلکہ کسمپرسی اور اپنوں کی بے اعتنائی، بے حسی اور بد دیانتی کا شکار اردو زبان کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ ہم تو عابد معز سے (معذرت کے ساتھ) عرض کریں گے کہ ان کی طنز نگاری سے اردو کو زیادہ ضرورت طبّی سائنس پر مزید ایسے کاموں کی ہے (جو وہ کرتے رہے ہیں)۔'

ماہنامہ اردو سائنس، نئی دہلی میں پہلی مرتبہ چھپنے (سنہ 1995) کے بعد میری اور سائنس کے بانی اور اعزازی مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے درمیان خط وکتابت شروع ہوئی اور پھر دوستی ہوگئی۔ سائنس کی توسیع اشاعت اور سائنسی اور معلوماتی ادب کو فروغ دینے کی کوششوں میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا ساتھ دینے لگا تو میری کوششوں کو مہمیز کرنے اور میری خدمات کو سراہنے کے لیے مجھے ماہنامہ سائنس کی مجلس مشاورت میں جون 1999ء سے شامل کرلیا گیا۔ اردو میں سائنسی علوم کو فروغ دینے کے لیے قائم کردہ ادارہ انجمن فروغ سائنس سے میں بھی جڑ گیا جس کا ترجمان ماہنامہ سائنس ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز سنہ 2002ء میں ریاض کے ہم خیال احباب کی دعوت پر سعودی عرب کا دورہ کیا تھا۔ اس مرتبہ سعودی کے دارالخلافہ ریاض اور منطقہ شرقیہ میں موصوف کے قرآن اور سائنس پر لیکچرس اور ماہنامہ سائنس کی توسیع اشاعت کے کامیاب پروگرام منعقد ہوئے۔ دو ہفتوں تک آپ کا ساتھ رہا اور ہم نے سعودی عرب کی صحرا نوردی بھی کی۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا اکتوبر 2015ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی (مانو)

حیدرآباد میں بحیثیت شیخ الجامعہ تقرر ہوا اور وہ نئی دہلی سے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سنہ 2016ء کے آواخر میں اپنے کیمپس میں 'اردو مرکز برائے فروغ علوم' قائم کیا جس کا مقصد تسلسل کے ساتھ علوم اور جدید مضامین میں اردو مواد کی تیاری اور اسے عوام الناس بالخصوص طلبہ اور محققین کو دستیاب کروانا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے اس مرکز میں پہلے کنسلٹنٹ کی حیثیت سے میری خدمات کے حصول کی پیش کش کی۔ میں خوشی خوشی اپنی مادری زبان کی اس خدمت کے لیے تیار ہوا اور چار سال (2016ء سے نومبر 2020ء تک) کارگزار رہا۔ ان چار برسوں میں ہر سال اسکول آف سائنس کے اشتراک سے اردو مرکز برائے فروغ علوم دو روزہ قومی اردو کانگریس 2017, 2018, 2019, 2020ء بڑی کامیابی کے ساتھ منعقد کرتا رہا جس میں ملک بھر سے اردو میں سائنس لکھنے والوں نے شرکت کی اور مقالات اور خیالات پیش کیے۔ قومی اردو سائنس کانگریس کی طرز پر پچھلے تین سالوں میں پہلی، دوسری اور تیسری قومی اردو سماجی علوم کانگریس بھی منعقد کی جاتی رہی ہیں۔ اس مرکز نے فراہنگ اور دیگر کتب کی تیاری اور اشاعت میں یونیورسٹی کے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشن (ڈی ٹی پی) سے تعاون کیا جس کے نتیجے میں چند اہم فراہنگ اور کتب شائع ہوئیں۔

جامعہ عثمانیہ میں اردو کے ذریعہ جدید طب (ایلوپیتھی) کی تعلیم اور اس جامعہ کے فارغ التحصیل اردو زبان وادب پرور ڈاکٹرس پر یہ نئی کتاب میری علمی وادبی میدان میں جاری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ امید کہ آپ میری محنت اور جستجو کو سراہیں گے۔

ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان

وسط 2023ء میں لندن آنے اور حیدرآباد سے لندن کے سفر کی تھکن اترنے اور لندن کے موسم سے ہم آہنگ ہونے کے بعد خیال آیا کہ برطانیہ میں جامعہ عثمانیہ کے ایسے میڈیکل ڈاکٹر یقیناً ہوں گے جنھیں اردو زبان وادب سے انسیت اور محبت ہوگی اور انھوں نے اردو زبان کو پروان چڑھانے میں حسبِ مقدور حصّہ لیا ہوگا۔ اس تلاش میں نوجوان دوست ڈاکٹر عمر بن حسن نے مجھے اپنے ایک دوست ڈاکٹر عادل علی خان کا تعارف کرواکر بتایا کہ ان کے چچا ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان کو اردو زبان وادب سے خاصی دلچسپی ہے اور انھوں نے دو ایک کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

ڈاکٹر عمر کے دیے گئے نمبر پر میں نے ڈاکٹر عادل سے رابطہ قائم کیا۔ ڈاکٹر عادل علی خان جو لندن میں جنرل پریکٹشنر ہیں بہت خلوص اور اپنائیت سے بات کی۔ اپنے چچا کا رابطہ نمبر دیا اور ساتھ ہی مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر کے دعوت بھی دے ڈالی۔

ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان سے میں نے فون پر رابطہ کیا تو ان کی آواز اور لہجے سے مجھے ایسے لگا کہ میں حیدرآباد میں اپنے کسی سینئر سے بات کر رہا ہوں۔ دورانِ گفتگو یہ احساس نہیں ہوا کہ میں ایک ایسے صاحب سے بات کر رہا ہوں جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے انگریزی ماحول اور تہذیب میں زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنی حیدرآبادیت اور اردو زبان سے تعلق بنائے رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر وطن جاتے رہتے ہیں بلکہ پچھلے چند برسوں سے ہر سال ہی حیدرآباد

جاتے اور دو ایک مہینے گزار کر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

میں خود بھی ڈاکٹر فصیح الدین اور ڈاکٹر عادل سے ملنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا اور ایک دن میں اپنے بڑے داماد ڈاکٹر محمد عبدالمجیب اقبال کے ساتھ ڈاکٹر عادل کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پر ہمارا استقبال ڈاکٹر فصیح الدین علی خان نے کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی صاحب زادیاں بھی موجود تھیں۔ سبھی سے مل کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر عادل علی خان جو ڈاکٹر فصیح الدین کے چھوٹے داماد بھی ہوتے ہیں آ گئے اور ہم نے پر تکلف حیدرآبادی ظہرانہ تناول کیا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ لندن کے ماحول میں کہیں ایک چھوٹا حیدرآباد ٹرانس پلانٹ کر دیا گیا ہے۔

اس مضمون میں ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان جو یہاں ڈاکٹر ایم ایف علی خان کہلائے جاتے ہیں کے متعلق اور ان کی اردو زبان سے انسیت، لگاؤ اور خدمات کے بارے میں لکھا جا رہا ہے وہ اس ملاقات میں ہوئی گفتگو سے اخذ کردہ معلومات ہیں۔

ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب محمد اکبر علی خان شہر کے نامور سرکاری وکیل تھے۔ ڈاکٹر ایم ایف علی خان نے ابتدائی تعلیم اردو میڈیم کے ذریعہ دارالعلوم ہائی اسکول سے حاصل کی۔ میٹرک کے امتحان کے نتیجہ کا دلچسپ واقعہ آپ نے سنایا کہ اس وقت بہت کم طالب علم درجہ اول میں کامیاب ہوا کرتے تھے اور عموماً نتیجہ میں رول نمبر کی تلاش تیسرے یعنی پاس کلاس سے کی جاتی تھی۔ آپ کے دوستوں نے بھی یہی کیا اور آپ کا نمبر تیسرے اور دوسرے درجوں میں نہ پا کر قیاس کر لیا کہ آپ فیل ہو چکے ہیں۔ لیکن دوسرے دن آپ کے بڑے بھائی نے نتیجہ دیکھ کر خوش خبری سنائی کہ وہ تو فرسٹ کلاس (درجہ اول) میں پاس ہوئے ہیں۔ اُس وقت میٹرک کے امتحان میں ساری ریاست آندھرا پردیش میں صرف بیالیس (42) طلبا پہلے درجہ میں کامیابی حاصل کی تھی۔

میٹرک کے بعد آپ کا داخلہ نظام کالج میں ہوا جہاں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی ایس سی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا اور انھوں نے سنہ 1964ء میں ایم بی بی ایس کا فائنل امتحان پاس کیا۔ ایک سال کی ہاؤس سرجن شپ مکمل کرنے کے

بعد سنہ 1966ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ روانہ ہوئے اور لندن کے رائل پوسٹ گریجویٹ میڈیکل اسکول میں پیڈیاٹرکس (امراض اطفال) میں مہارت اور ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے لندن ہی میں جنرل پریکٹس کی ٹریننگ حاصل کی۔ آپ نے امریکہ جانے کا اہلیتی امتحان ای سی ایف ایم جی بھی پاس کیا لیکن امریکہ جانے کے بجائے برطانیہ میں رہنا اور کام کرنا پسند کیا۔ آپ نے طب کے شعبہ جنرل پریکٹس (General Practice) کو منتخب کیا۔ ڈاکٹر موصوف کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں۔ دونوں نے مل کر برطانیہ میں بخوبی جنرل پریکٹس سروس انجام دی اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر فصیح الدین علی خان اپنی پیشہ ورانہ ذمّہ داریوں اور مصروفیات کے بعد اردو زبان اور اپنی کمیونٹی (سماج) سے محبت اور خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بتلاتے ہیں۔ زندگی میں پیشہ ورانہ مصروفیت کے بعد انھیں جو وقت اور ذرائع حاصل ہوئے ان سے وہ یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ایسے کام وہ طالب علمی کے زمانے سے کرتے آ رہے ہیں۔ عثمانیہ میڈیکل کالج میں پانچ سالہ تعلیم کے دوران وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے کالج کی سالانہ تقاریب میں مشاعرہ کا انعقاد عمل میں لاتے رہے ہیں۔ وہ 'میر مشاعرہ (Chairman of Mushaira)'، ہوا کرتے تھے۔ طالب علمی کے دور میں لکھی گئی نظمیں اور مضامین کالج میگزین میں شائع بھی ہوئے ہیں۔

طالب علمی کے زمانے کے بعد بھی ڈاکٹر فصیح الدین علی خان نے اردو میں مضامین لکھے جو برطانیہ، حیدرآباد اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اردو زبان کے بارے میں اور اس کے فروغ کے حوالے سے آپ نے خاصے مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان مضامین سے چند اقتباسات پیش ہیں۔

☆ اردو میں مافی الضمیر ادا کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ اس میں تحکمانہ انداز بھی ہے، عاجزی بھی ہے۔ اس میں اختصار سے بڑے سے بڑے مطالب اور مدعا بیان کرنے کا سلیقہ بھی ہے۔

☆ بچہ ایک سے زیادہ زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے دماغ اور ذہن میں کافی صلاحیت ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے زیادہ ذہین، کامیاب اور مقبول ہوتے

ہیں۔ان کے لیے ملازمت اور کاروبار میں زیادہ آسانیاں پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

☆ اردو ہماری مادری زبان ہے اور مادری زبان سے انسان کا زبردست رشتہ ہوتا ہے۔اس میں بچہ پرورش پاتا ہے۔ذہنی، جذباتی اور تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرتا ہے۔انسان اپنی مادری زبان میں خواب دیکھتا ہے۔خوشی، مسرت وغصہ کا اظہار بھی اپنی مادری زبان میں کرتا ہے۔

ڈاکٹر فصیح الدین نے اردو زبان میں دو کتابیں 'ارتقاء تمدن میں اسلام کا حصّہ' اور 'عقیدۂ آخرت اور جنت کی نعمتیں' تصنیف اور تالیف کی ہیں اور انگریزی زبان میں Quranic Verses اور Guide کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں۔تمام کتابیں لندن اور حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحب اپنے ملاقاتیوں کو تحفتاً پیش کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی دو کتابیں مجھے بھی عنایت کی۔

اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے ڈاکٹر فصیح الدین نے نوجوانوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے۔انڈین مسلم فیڈریشن، یو کے کے ایک ذمّہ دار عہدیدار کی حیثیت سے انھوں نے اردو ڈراموں جیسے ٹیپو سلطان، مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کی پیشکشی میں بھرپور تعاون کیا ہے۔نوجوان فن کاروں کے ان ڈراموں کو لندن کے مختلف علاقوں میں پیش اور پسند بھی کیا گیا۔

برطانیہ میں موجود اردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کی نمائش کا اہتمام سنہ 1982ء میں کیا گیا تھا جسے سینکڑوں لوگوں نے دیکھا۔نمائش کے بعد یہ کتابیں لائبریریوں کو دی گئیں۔آپ کی خواہش ہے کہ اس قسم کی کتابوں کی نمائش اب بھی ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر فصیح الدین علی خان کو شاعری سے شغف ہے اور گاہے بہ گاہے شعر بھی کہتے ہیں۔مشاعروں میں کم ہی حصّہ لیتے ہیں لیکن مشاعروں کے انعقاد میں سرگرم حصّہ لیتے ہیں۔میرے سوال پر کہ کیا آپ کا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے؟ کہنے لگے کہ میں اتنا بڑا شاعر نہیں ہوں جس کا مجموعہ کلام شائع ہوتا۔شاعری سے دلچسپی ہے سو کبھی کبھار شعر کہہ کر دل بہلا لیا کرتا ہوں۔میں نے ان سے چند شعری تخلیقات عنایت کرنے کی درخواست کی جسے اس مضمون شامل کرسکوں۔تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انھوں نے میری درخواست قبول کر لی۔

غزل

ہر ایک شخص یہ کہتا ہے مجھ سے تو کیا ہے
عدو نہیں ہوں میں اِن کا پر اِن کی خو کیا ہے

تمھارے شہر میں کچھ دن رہے تو جان لیا
تمھارے شہر میں انسان کی آبرو کیا ہے

یہ حرف و صوت کا احسان کیوں اٹھائے کوئی
نظر ملا کے دیکھو کہ گفتگو کیا ہے

متاعِ دل تری چوکھٹ پہ ڈال آئے ہیں
کرم کرو کبھی پوچھو تو آرزو کیا ہے

ہزار بار صدا دی ہے میرے دل نے اُسے
پر اس نے بھول کے پوچھا نہ آرزو کیا ہے

بتوں کو چھوڑ کے نکلے تلاشِ یزداں میں
فرشتے دیکھا کیے میری جستجو کیا ہے

دو قطعات

خاک کر دے گی تجھے بے حسی و بے عملی
ایک جذبے نے یہ سو بار جتایا ہے مجھے
جستجو اُس کی کبھی سرد نہ ہونے پائے
ہے وہ اک گوہرِ نایاب کہ پانا ہے تجھے

خدا کرے کہ بدل جائے رسمِ چنگیزی
کہ جس سے روح کے پرزے ہزار ہونے لگے
بہ فیض رقّت جاں اب یہ دل کا عالم ہے
کہیں جو آہ سنی بے قرار ہونے لگے

حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن، یو کے کے ٹرسٹی کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر فصیح الدین علی خان نے اردو زبان اور سماج کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ چودہ سال تک Nationwide Local Medical Committee کے منتخب نمائندہ کی حیثیت سے بارہا ایسی تجاویز پیش کی

ہیں جس سے انگریزی میں کمزور اور صرف اردو جاننے والے مریضوں کے لیے اردو مترجم کا انتظام کیا گیا اور اردو زبان میں صحت کی تعلیم میں بہتری بھی ہوئی۔

آخر میں، میں نے برطانیہ میں اردو کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی تو ان کا جواب تھا کہ اردو بول چال کی زبان کی حیثیت سے مقبول ہوتی جارہی ہے لیکن افسوس اور مایوسی اس بات کی ہے کہ اس ملک میں سبھی ماں باپ کو فکر ہوتی ہے کہ ان کا بچہ انگریزی میں مہارت پیدا کرے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انگریزی کے تعاقب میں مادری زبان بالخصوص اردو نظر انداز ہو جاتی ہے اور اردو پر ایسا ستم اکثر ہوتا ہے۔

یہاں مدارس میں ذولسانی فارمولا انگریزی اور کوئی یوروپی زبان رائج ہے۔ بعض علاقوں میں جہاں ایشیائی باشندوں کی بہتات ہے اردو پڑھنے لکھنے کی سہولت دی گئی ہے۔ بعض لوگ اردو زبان لیتے بھی ہیں لیکن جلد ہی انھیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ پھر وہ اردو سے دوری اختیار کر کے کوئی یوروپی زبان سیکھنے لگتے ہیں جس میں انھیں فائدہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر فصیح الدین علی خان مختلف سماجی کاموں میں حصّہ لیتے رہتے ہیں۔ لندن میں لڑکیوں کے ایک مشہور خانگی ہائی اسکول کا انھیں تین مرتبہ تین تین برسوں کے لیے گورنر بنایا گیا۔ پھر انھوں نے اپنی ذمّہ داریوں سے رضا کارانہ سبکدوشی اختیار کر لی۔ اسی طرح کی سماجی سرگرمیوں میں نمایاں حصّہ لینے پر ڈاکٹر فصیح الدین علی خان کو ایم بی ای (MBE، ممبر آف برٹش امپائر) کے اعلی اعزاز کے لیے انھیں سنہ 2010ء میں نامزد کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان سے ملاقات کر کے واپس ہوتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ وقت وقت کی بات ہے اور تاریخ اپنا سفر طے کرتی ہے۔ ماضی میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طالب علم اردو کی شمع روشن رکھنے میں دنیا کے مختلف حصّوں میں سرگرداں رہتے ہیں تو اب جامعہ عثمانیہ سے ہی اردو غائب ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف احمد

ڈاکٹر محمد یوسف احمد کا تعارف مجھے ان کی کتاب 'صحت ہزار نعمت' سے ہوا جو سنہ 2009ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب جناب محمد یوسف مڑکی نے چند برس پہلے مجھے نذر عنایت کی تھی۔ جناب یوسف مڑکی سائنسی مضمون نگار ہونے کے علاوہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے دو روزناموں 'منصف' اور 'اعتماد' کے ہر ہفتہ دو سے چار صفحوں کا سائنس، ٹیکنالوجی اور صحت وطب سپلیمنٹ تقریباً دو دہوں تک مرتب یا ایڈٹ کرنے کا محنت طلب اور منفرد کام کرتے رہے تھے۔

طبی سپلیمنٹ تیار کرکے سلسلہ میں یوسف مڑکی کی دوستی شہر کے نامی گرامی اردو دان ڈاکٹروں سے ہوگئی تھی جو ان سے تعاون کیا کرتے تھے اور بدلہ میں موصوف ان ڈاکٹروں کی کتابوں کی اشاعت میں معاوون و مددگار ہوا کرتے تھے۔ ان کے دوست ڈاکٹروں میں خود میں، ڈاکٹر گوڑ اور ڈاکٹر محمد یوسف احمد شامل تھے۔

محمد یوسف مڑکی سے ان کے ہم نامی ڈاکٹر محمد یوسف احمد کی کتاب لے کر میں نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ فی الوقت وہ امریکہ میں ہیں، جب آئیں گے تو ان سے مل بھی لیں گے۔ یہ واقعہ کوئی دس ایک برس پرانا ہے۔ اس دوران یوسف مڑکی صاحب کا انتقال دسمبر 2018ء میں ہوا۔

اب جب میں جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور ڈاکٹروں کے بارے میں لکھنے بیٹھا

ہوں تو مجھے ڈاکٹر محمد یوسف احمد کی یاد آئی۔ ان کی کتاب 'صحت ہزار نعمت' میں ڈاکٹر محمد یوسف احمد کے دو پتے دیے گئے ہیں۔ ایک حیدرآباد کے محلّہ مغل پورہ کا ہے تو دوسرا امریکہ کے پنسلوانیہ ریاست کا ہے۔ مزید معلومات کے لیے میں ان کے حیدرآباد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور اس محلّہ میں رہائش پذیر دونو جوان دوست اور سرجن ڈاکٹر عمر بن حسن اور ڈاکٹر محمد جلال کے ساتھ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کے مکان پہنچا۔ یہ دونوں، ڈاکٹر محمد یوسف احمد کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

کتاب میں دیے گئے پتے کے مکان پر ڈاکٹر محمد یوسف احمد کے نام کی تختی لٹک رہی تھی لیکن مکین کوئی دوسرے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب مکان ہی نہیں دنیا چھوڑ کر ملک عدم جا چکے ہیں۔ پنسلوانیہ، امریکہ میں ڈاکٹر محمد یوسف احمد صاحب کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ہم نے اظہار تعزیت کی اور واپس لوٹ آئے۔

ڈاکٹر محمد یوسف احمد کے متعلق معلومات کا ذریعہ میرے یہاں اب ان کی کتاب 'صحت ہزار نعمت' ہی ہے جس کے سہارے میں یہ مضمون تحریر کر رہا ہوں۔ کتاب میں دو صفحات پر 'کوائف حیات' کے عنوان سے مصنف کے بارے میں نہایت مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں محمد یوسف مڑکی کا 'پیش لفظ' اور ڈاکٹر محسن جلگانوی کا تعارفی مضمون 'ڈاکٹر محمد یوسف احمد کی طبّی تحریریں' اور ڈاکٹر یوسف احمد کی مختلف طبی موضوعات پر سینتیس مضامین شامل ہیں جو مختلف جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

کوائف حیات کے مطابق ڈاکٹر محمد یوسف احمد 15 جون 1940ء کو ناندیڑ، مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے اور آپ کے والد کا نام الحاج شیخ احمد تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ناندیڑ اور حیدرآباد میں ہوئی اور گورنمنٹ ہائی اسکول، چادر گھاٹ، حیدرآباد سے میٹرک پاس کیا۔ گریجویشن سے پہلے ڈاکٹر محمد یوسف احمد نے حیدرآباد سے پی یوسی (پری یونیورسٹی کورس)، ناندیڑ سے پی پی سی (پری پروفیشنل کورس) اور آرٹس کالج، جامعہ عثمانیہ سے سرٹیفکٹ کورس ان لائبریرین شپ کیا۔

آگے کی تعلیم، ملازمت اور مشاغل کے تعلق سے ڈاکٹر محسن جلگانوی لکھتے ہیں۔ 'ڈاکٹر محمد

یوسف احمد کی زندگی کے کوائف پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم، ملازمت اور مشاغل کا سفر مختلف جہتوں میں تقسیم رہا جس کا اجتماع کسی ایک شخصیت میں شاذ ہی ملتا ہے۔ تعلیم کے باب میں انھوں نے بی ایس سی اور پھر بی ایس سی (اگریکلچر) پاس کیا۔ بعدازاں کاکتیہ میڈیکل کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔

یہی نہیں کہ انھوں نے انگریزی زبان کے ذریعہ یہ ڈگریاں حاصل کیں بلکہ اردو زبان سے ان کی محبت اور دل بستگی کے باعث انھوں نے بی او ایل اور ایم اے اردو کی تکمیل کی۔ مستزاد یہ کہ 'ایچ۔ای۔ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی علمی و ادبی خدمات' کے موضوع پر آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم فل کی تکمیل بھی کی۔

'کوائف حیات' میں ان ڈگریوں کے حصول کا سن نہیں دیا گیا، اس لیے اندازہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کتنے برس تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کے برخلاف ڈاکٹر محمد یوسف احمد نے ملازمت کے لیے ایک ہی شعبہ فزیالوجی (فعلیات) کا انتخاب کیا اور آپ نے فیکلٹی ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی میں پہلے گاندھی میڈیکل کالج اور پھر دکن کالج آف میڈیکل سائنسس میں سنہ 1973ء سے سنہ 2003ء تک برسرکار رہے اور آپ نے ایم بی بی ایس کے طالب علموں کو فزیالوجی پڑھائی۔ اس دوران کچھ عرصہ نائجیریا میں بحیثیت سینئر میڈیکل آفیسر سنہ 1979ء سے سنہ 1984ء تک کام کیا۔

ڈاکٹر محسن جلگانوی مزید لکھتے ہیں کہ 'ڈاکٹر محمد یوسف احمد کا ایک خاص شغف مختلف مذاہب اور دنیا کی مختلف تہذیبوں کا مطالعہ بھی رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کرتے رہے ہیں۔' کوائف حیات میں ڈاکٹر محمد یوسف احمد کے اسفار کی فہرست دی گئی ہے جن میں سری لنکا، پاکستان، عمان، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، ملیشیا، سنگاپور، ہالینڈ، برطانیہ عظمی، نائجیریا، کیمرون اور امریکہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف احمد کی تعلیم جس طرح مختلف جہتوں میں ہوئی، اسی طرح آپ کی دلچسپی اور مشاغل بھی مختلف جہتوں میں رہے اور آپ نے مختلف ممالک کا سفر بھی کیا لیکن متنوع زندگی کے

باوجود آپ کی اردو زبان وادب سے وابستگی ہمیشہ برقرار رہی۔ اردو زبان وادب سے یہی دلچسپی کا نتیجہ رہا ہے کہ آپ نے صحت عامہ اور طب کے مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے اور ایک مجموعہ 'صحت ہزار نعمت' کا ہمیں علم ہے۔

ایک اہم کتاب بعنوان 'مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترقی وترویج' جسے ایچ دی ایچ نظامس ٹرسٹ نے شائع کیا ہے، میں ڈاکٹر محمد یوسف احمد نے ایک اہم باب 'ریاستِ حیدرآباد کے کتب خانے اور لائبریری سائنس' لکھا ہے۔

انھوں نے ترجمہ نگاری اور افسانہ نگاری بھی کی اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ آیا ان اصناف میں ان کی کوئی کتاب بھی ہے لیکن یقین ہے کہ ان کے یہاں مختلف النوع اردو تحریروں کا ایک وافر ذخیرہ موجود تھا ہوگا۔

آخر میں کتاب 'صحت ہزار نعمت' کے بارے میں عرض کرنا ہے کہ اس میں صحت بہتر بنانے اور مختلف عام امراض کے متعلق مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زبان وبیان کا ایک نیا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے متعلق جناب محمد یوسف مڑکی نے 'پیش لفظ' میں لکھا ہے کہ 'ڈاکٹر صاحب تمام عمر ڈاکٹروں کو پڑھانے میں گزاری لیکن اردو زبان اور اس کے ادب سے ہمیشہ وابستگی رہی۔ اسی گہرے لگاؤ کے باعث انھوں نے اردو زبان وادب سے ایم فل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طب وصحت کے گہرے مسائل سے مملو مضامین ڈاکٹر صاحب کیوں کر اتنے دل آویز انداز میں لکھ پاتے ہیں۔ تحریر کا اسلوب اور انداز ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور یہ صلاحیت ڈاکٹر صاحب میں بچپن ہی سے پروان چڑھتی رہی ہے۔'

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر محمد قطب الدین

شہرِ حیدرآباد سے ایک ہفت روزہ اخبار 'گواہ' پچھلے پچیس برسوں سے شائع ہورہا ہے۔ یہ ہفتہ وار شہر اور شہر بلکہ ملک سے باہر بھی پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اس اخبار میں ڈاکٹر محمد قطب الدین، ماہر نفسیات شکاگو، امریکہ کے تحریر کردہ دو ایک مضامین میں نے پڑھے اور پھر ایک شمارہ میں ڈاکٹر صاحب کی امریکہ سے آمد اور حیدرآباد میں ان کے ایک پروگرام کی روداد بھی پڑھی تو مجھے ڈاکٹر محمد قطب الدین کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی۔

میں نے گواہ کے ایڈیٹر انچیف ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز جو میرے پرخلوص دوست اور کرم فرما بھی ہیں سے استفسار کیا۔ ایڈیٹر انچیف نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد امریکہ منتقل ہوئے اور بڑی پابندی سے اپنے وطن آتے رہتے ہیں۔ نفسیات اور سماجی موضوعات پر اردو میں مضامین تحریر کرتے رہتے ہیں۔ میں ان کا نمبر واٹس ایپ کرتا ہوں، بات کر لیجیے۔ آپ کو ان سے مل کر خوشی ہوگی۔

میں نے فون پر ڈاکٹر محمد قطب الدین سے رابطہ کیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ انکشاف ہوا کہ وہ اور میں ستر کے دہے میں ایک ساتھ الگ الگ جماعتوں میں عثمانیہ میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے ہیں اور انھوں نے مجھ سے چھ مہینے یا ایک سال پہلے ایم بی بی ایس کا فائنل امتحان پاس کیا تھا۔ ہم نے دو ایک مشترکہ دوستوں کی پہچان بھی کی۔ ہم

نے اپنے درمیان دوسری مشترکہ بات یہ بھی دریافت کہ کہ ہم دونوں کے آباواجداد کا تعلق ایک ہی ضلع محبوب نگر سے ہے۔اس طرح ہمیں ایک دوسرے سے مل کر حقیقی معنوں میں خوشی ہوئی۔

ڈاکٹر محمد قطب الدین حیدرآباد سے 180 کلومیٹر دور نارائن پیٹھ نامی قصبہ کے ایک نامور علمی خاندان میں 12 نومبر 1956ء میں پیدا ہوئے۔ نارائن پیٹھ جو پہلے ایک موضع تھا، تعلقہ بنا اور اب ضلع بنادیا گیا ہے۔ آپ اپنی جائے پیدائش سے جڑے ہوئے ہیں اور چھٹیوں میں جب ہندوستان آتے ہیں اپنے وطن کا نہ صرف دورہ کرتے ہیں بلکہ وہاں چند دن گزارتے بھی ہیں۔ اپنے وطن کی بہتری اور ترقی میں حصّہ بھی لیتے ہیں اور جب کبھی حب الوطنی جوش مارتی ہے فیس بک پوسٹنگ پر اپنے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

'آپ کا مخلص،

محمد قطب الدین ابوشجاع، ایم ڈی، پی ایچ ڈی،

شکاگو، امریکہ / نارائن پیٹھ، انڈیا'

ڈاکٹر قطب الدین کے والد ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ پیشہ طبابت سے وابستہ تھے اور دادی ماں محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ جڑی بوٹیوں اور دیسی طریقے سے لوگوں کا علاج معالجہ کیا کرتی تھیں۔ بچپن میں وہ اپنے والد کی کلینک میں کام کرنے کے علاوہ نسخوں کی تیاری میں دادی اماں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اس ماحول کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ انھوں نے کم عمری ہی میں ڈاکٹر بننے کا ارادہ کرلیا تھا جس میں الحمدللہ وہ کامیاب بھی ہوئے۔

ڈاکٹر محمد قطب الدین خان کی اسکولی تعلیم نارائن پیٹھ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہوئی۔ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی اور انھوں نے سنہ 1969ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسکول کے بارے میں بتلایا کہ ایک چھوٹے شہر یا قصبہ کے سرکاری اسکول میں چار زبانوں اردو، تلگو، ہندی اور کنڑا میں تعلیم دی جاتی تھی۔ تلگو ریاست تلنگانہ اور آندھرا پردیش اور کنڑا پڑوسی ریاست کرناٹک کی زبانیں ہیں۔

طالب علموں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولت اور رواج ریاستِ حیدرآباد

میں آزادی سے پہلے سے چلا آرہا ہے جواب بھی سابق ریاستِ حیدرآباد کے بعض مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اسکول اور پری یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد ڈاکٹر قطب الدین کا داخلہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں ہوا اور سنہ 79-1978ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر ڈاکٹر محمد قطب الدین امریکہ چلے آئے اور اسی وقفہ میں آپ کی شادی ہوگئی۔ امریکہ اور کنیڈا میں ڈاکٹر قطب الدین 'ابوشجاع' کی کنیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

امریکہ پہنچنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے نفسیات (سائیکاٹری، Psychiatry) میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر قطب الدین نے سنہ 1981ء سے سنہ 1984ء تک یونیورسٹی آف مسّی سوری، کولمبیا میں نفسیات میں ریذیڈنسی کی اور پھر تین سال سنہ 1984ء سے سنہ 1987ء تک فیلوشپ کی۔ فیلوشپ کے بعد بھی نفسیات میں اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور سنہ 1989ء میں انڈیانا یونیورسٹی سے کلینکل سائیکالوجی (Clinical Pschology) میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی۔ یوں ڈاکٹر صاحب نے انسانی نفسیات کے مختلف شعبوں میں مہارت اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی۔

تعلیم مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع نے چند برسوں تک مختلف دواخانوں میں کام کیا پھر اپنا ایک نجی ادارہ بنام اسٹار سائیکاٹرک سروسز (Star Psychiatric Services)' قائم کیا جس کے وہ ڈائرکٹر کی ہیں۔ اس ادارہ کے تحت انڈیانا اور الینوائے میں سائیکاٹری کلینکس چلتے ہیں جن میں ہر قسم کے دماغی عارضہ کے علاج معالجہ کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔

ڈاکٹر قطب الدین کی ماہرانہ خدمات پر سنہ 2012ء میں انڈیانا ریاست سے Best Psychiatrist Award 2012 اور سنہ 2015ء میں الینوائے ریاست سے Prominent Service Award مل چکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ان کی خدمات پر امریکہ اور ہندوستان میں مختلف ایوارڈس سے نوازا گیا ہے۔

ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے علاوہ ڈاکٹر قطب الدین امریکہ

اور ہندوستان کی نفسیات کی مختلف انجمنوں کے ممبر ہیں اور اس حیثیت سے علمی مذاکروں اور محفلوں میں حصّہ لیتے رہتے ہیں۔ آپ جامعہ ابن خلدون ترکی میں نفسیات کے بیس برسوں تک وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے ہیں۔ آپ کو دنیا کے مختلف شہروں میں نفسیات کے موضوع پر خطاب کرنے اور کلیدی خطبہ دینے کے لیے مدعو بھی کیا جاتا ہے۔ آپ کے مضامین اور انٹرویوز پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا میں شائع اور نشر ہوتے رہتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ ہونے اور اردو ماحول ملنے کے سبب ڈاکٹر قطب الدین کو اردو زبان اور شعر شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ بچپن میں وہ اپنے شہر کی محفلوں میں حمد اور نعت سنایا کرتے تھے۔ اردو میں تقریر کرنے کا بھی انھیں موقع ملتا تھا۔ بچپن اور اسکول کے دور میں انعامی مقابلوں میں انھیں انعامات بھی ملے ہیں۔ بچپن کا یہ شوق آج بھی برقرار ہے اور وہ سوشل میڈیا پر حمدیہ اور نعتیہ کلام پوسٹ کرتے اور خود اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے سناتے بھی ہیں۔ موقع اور محل کی مناسبت سے اساتذہ کا کلام بھی لکھ کر اس کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لکھی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں خوش خطی اور کتابت سے بھی دلچسپی رہی ہے۔

مختلف موقعوں جیسے نیا سال، عید، تہوار، اور مختلف دنوں جیسے یوم آزادی، عالمی یوم صحت، یوم پدر وغیرہ پر ڈاکٹر قطب الدین سوشل میڈیا پر اردو اور انگریزی میں اپنے دوست احباب کو پیامات، خیالات، مبارکباد اور نیک خواہشات ارسال کرتے ہیں۔ 'زندگی کے اسباق (The Lessons of life)' کے عنوان سے وہ اپنے تجربات بیان کرتے اور مشورے بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد قطب الدین آن لائن پروگرام بھی کرتے جس میں وہ نوجوان کے مسائل حل کرتے اور انہیں مشورے بھی دیتے ہیں۔

اسکولی تعلیم کے آخری دور میں سنہ 1969ء میں ڈاکٹر قطب الدین نے اپنے شہر نارائن پیٹھ میں 'اسلامیہ لائبریری' کا قیام عمل میں لایا تھا جس میں بیشتر اردو کتابیں ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ لائبریری نہ صرف قائم ودائم ہے بلکہ لوگ اب بھی مستفید ہوتے ہیں۔

سوشل میڈیا پر مادری زبان اردو اور ضرورت کی زبان انگریزی میں پیامات ارسال کرنے کے علاوہ ڈاکٹر قطب الدین اردو میں مضامین لکھتے ہیں جو مختلف جرائد بشمول گواہ، منصف، ایشیا ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خود مضامین لکھنے کے علاوہ صحافی حضرات کے ڈاکٹر صاحب کے متعلق مضامین اور ان کے انٹرویوز بھی اردو اخبار اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ صحافی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے جیسے متمنی رہتے ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب بھی ان سے ملنے کے لیے بیتاب اور مشتاق رہتے ہیں۔ اس تعلق کے نتیجہ میں ڈاکٹر محمد قطب الدین کے خاصے انٹرویوز شائع ہوئے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے شہر سے تعلق رکھنے والے اردو کے نامور صحافی ڈاکٹر تبریز حسین تاج نے ڈاکٹر قطب الدین کے انٹرویوز پر مبنی مضامین کو کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے جو 'زیستِ عزم و ہمت' کے نام سے جلد شائع ہونے والی ہے۔

انٹرویوز پر مبنی مضامین کی کتاب کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے۔ یہ بھی بہت جلد کتابی شکل میں پیش کیا جائے گا۔

سماج میں ڈاکٹر محمد قطب الدین بہت فعال اور متحرک رہتے اور اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں ہندوستانی نژاد لوگوں کی تنظیم 'افمی' (AFMI, American Federation of Muslims of Indian origin) کے صدر کے طور پر انھوں نے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی دوستی مشہور زمانہ باکسر محمد علی کلے سے ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب محمد علی کلے کے بارے میں کہتے ہیں کہ عالمی باکسنگ چمپئن ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں سادگی کا عنصر غالب تھا۔ وہ جب بھی میرے گھر آتے ان کے رویہ میں کبھی بھی رتبے و مرتبے کا رعب نظر نہیں آتا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے مجھے کسی چیز کا خوف نہیں، سوائے خدا کے، مجھے اس کے سامنے جواب دہی سے ڈر لگتا ہے۔

ترکی موجودہ صدر سے بھی ان کے مراسم ہیں اور ڈاکٹر محمد قطب الدین ان کی شخصیت سے بھی خاصے متاثر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ رجب طیب اردوان اعلی منصب پر ہوتے ہوئے بھی

ان کے اندر سادگی اور متانت ہے۔

امریکہ میں مختلف سماجی اور اردو کی محفلوں کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں اور جب وہ ہندوستان آتے ہیں تو اپنے وطن نارائن پیٹھ، حیدرآباد، اورنگ آباد اور دوسرے شہروں میں دماغی اور جسمانی صحت سے متعلق اردو زبان میں میڈیکل کیمپس کے انعقاد اور تعلیمی اور سماجی بیداری پروگرام منعقد کرنے میں بھی اہم رول نبھاتے اور اپنی چھٹیوں کو کارآمد بناتے ہیں۔ اردو سے محبت کے اظہار کا یہ ایک منفرد انداز ہے۔

ڈاکٹر محسن جلگانوی

ڈاکٹر رنگا راؤ رنگینؔ

جناب رنگینؔ سکندرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کا نام رنگا راؤ تھا۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی اور پھر ڈی سی ایچ کی ڈگری کی تکمیل بھی کی تھی۔

رنگا راؤ رنگینؔ لحیم شحیم جسامت اور بھاری آواز کے ساتھ مشاعرے پڑھتے اور بسا اوقات شاعری میں اپنی اختراعات سے محفل کو زعفران زار بھی بنادیتے تھے لیکن وہ بہت زود گو شاعر تھے۔ اردو کے بہت کم شاعر ہوں گے جنھیں اپنی زبان سے اس قدر پیار رہا ہو جتنا رنگا راؤ رنگینؔ کو تھا۔ ان کے یہاں بلا ناغہ اردو کے اخبارات آتے اور وہ اردو جرائد اور کتابیں خرید کر پڑھتے۔

رنگا راؤ رنگینؔ کے زیرِ مطالعہ جو بھی شگفتہ زمین کی غزل آجائے اس زمین میں شعر کہنا ان کے لیے بہت آسان کام تھا۔ وہ بہت مہمان نواز بھی تھے اور اکثر و بیشتر اپنی رہائش گاہ واقع سیتا پھل منڈی میں شعری محفلیں منعقد کر کے ادبی احباب کی خاطر و مدارت کرتے تھے۔ سیتا پھل منڈی ہی میں ان کا مطب بھی تھا جہاں سے اکثر و بیشتر شاعر حضرات مفت کی دوائیں لینے کے لیے ڈاکٹر رنگینؔ کے پاس پہنچ جاتے تھے اور ان کی دس بیس غزلیں سن کر معاوضتاً اپنے مرض کی دوا لے آتے۔

ڈاکٹر رنگینؔ نے غالباً دو دہوں تک مسلسل اور انتھک شاعری کی۔ انھوں نے پہلے رسا دہلوی اور پھر پروفیسر عطا الرحمٰن عطا کو اپنا کلام سنایا لیکن وہ اپنے کسی بھی ہم عصر شاعر کے مشورے کو مان لیتے اور اپنے شعروں میں ردّ و بدل کر لیتے تھے۔

غزلیں

تڑپتا ہے لہو میں تن کسی کا
بنفشہ زار ہے دامن کسی کا
مرا سینہ بنا گلشن کسی کا
سمایا آنکھ میں جوبن کسی کا
ہوا کوچہ کی تیری جس کو بھائی
نہیں بھاتا اسے گلشن کسی کا
رلائے گا لہو عاشق کو ہر دم
عزیزو سرخ پیراہن کسی کا
مسافر خانہ ہے دنیا یہ رنگینؔ
رہا ہے کب یہاں مسکن کسی کا

☆

سرور وکیف کا عالم رہا ہے آنکھوں میں
وہ نقشِ میکدہ دائم رہا ہے آنکھوں میں
کچھ ایسے تیرے تصور میں کھو گیا ہر دم
جمالِ یار ہی پیہم رہا ہے آنکھوں میں
مرا یہ عشقِ مجازی نہیں حقیقی ہے
تمھارے حسن کا عالم رہا ہے آنکھوں میں
ہر آنسو خون کا چپکے سے پی گیا رنگینؔ
تبھی تو غم مرا مبہم رہا ہے آنکھوں میں
تری جدائی کا صدمہ نہ سہہ سکا رنگینؔ
ترے فراق کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

☆

شجر کو عشق کے نہ باغباں تراش کے پھینک
جفائیں جن میں ہوں ڈالیاں تراش کے پھینک
ہر ایک خوشہ سے ٹپکے شراب وحشت کی
ہیں کفر و شرک کی جو بالیاں تراش کے پھینک
مری نظر میں مرا عشق، عشق صادق ہے
تری نظر ہو اگر، رائیگاں تراش کے پھینک
کروں جو اور کو سجدہ تو سر قلم کر دے
غلط کہوں تو خوشی سے زباں تراش کے پھینک
ہیں ایسی داستاں جس کا ہر اک ورق رنگینؔ
اگر ہو قصّہِ آہ وفغاں تراش کے پھینک

☆ ☆ ☆

رنگین صاحب کی شاعری بہت سہل شاعری تھی۔ وہ اپنی بات کو بہت آسانی کے ساتھ دوسروں تک پہنچادیتے تھے۔ جب کلام پڑھتے تو اس گرجدار آواز میں کہ سننے والا خواہ مخواہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا۔ رنگین صاحب بلڈ پریشر کے مریض تھے اور خلاف توقع کسی واقعہ ہو جانے پر برہم ہو جایا کرتے تھے لیکن وہ اندر سے بہت مخلص آدمی تھے۔

رنگین صاحب بزم ادب کے زمانے سے سکندرآباد کے ادبی حلقوں میں مقبول رہے اور پھر کاروانِ ادب، بھارتیہ ساہتیہ کلا سنگم اور شہنشاہِ ادب کی شعری و ادبی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے تھے۔

رنگاراوٴ رنگین کو ہمیشہ اس بات کا ملال رہا کہ سکندرآباد میں بہت منظّم طور پر اردو کی ترویج کے لیے کوئی کام نہیں کیا گیا اور حیدرآباد کے اربابِ اردو نے اس شہر کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ ایک مکمل اردو لائبریری کے قیام کے بھی خواہش مند تھے اور 'اردو ہال' کی طرز پر ایک اردو گھر سکندرآباد میں تعمیر کروانے کے آرزومند تھے۔

رنگاراوٴ رنگین چند برس قبل چپکے سے اس دنیا سے اٹھ گئے۔ اردو کے اس چہیتے شاعر کی موت کی خبر تک اخباروں میں نہیں چھپی۔ نہ کسی انجمن نے ان کا تعزیتی جلسہ کیا نہ کوئی قرارداد پیش ہوئی۔

رنگاراوٴ رنگین کا بہت بڑا شعری سرمایہ ان کے صاحب زادوں کے یہاں جو اردو سے ناواقف ہیں پڑا ہوگا لیکن کیا اردو کا کوئی ادارہ ان کے کلام کو لے کر اور شائع کر کے اردو زبان کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کی ذمّہ داری نبھانے کی زحمت کرے گا؟

'سکندرآباد کی ادبی دستاویز'۔ دسمبر 1988ء
تالیف وتدوین: ڈاکٹر محسن جلگانوی،
ناشر: ادارۂ اردو رائٹرز فورم، آندھرا پردیش۔ ص 163-162۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان

پروفیسر احمد محی الدین

(پروفیسر احمد محی الدین پر ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کا یہ مضمون روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، مورخہ 12 اپریل 1999ء میں شائع ہوا تھا جسے عائشہ فاطمہ نے اپنے مقالے میں تاثرات کے ساتھ شامل کیا ہے۔ وہیں سے اس مضمون کو نقل کیا گیا ہے۔)

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے اپنے مضمون میں اپنے ہم جماعت اور عزیز دوست ڈاکٹر احمد محی الدین کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے تا کہ ان کی ہمہ جہتی شخصیت سے اہل حیدرآباد کو خاص طور پر نئی نسل کو متعارف کرواسکیں۔

حیدرآباد نے کیسی کیسی عبقری شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے نہ صرف دکن کی بلکہ ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں اپنی قابلیت، کردار، پہلودار شخصیت سے خود کا اور اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ انہیں میں قابل ذکر پروفیسر احمد محی الدین کا نام بھی ہے۔

ڈاکٹر منان اپنے مضمون میں ان کی حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: احمد محی الدین جو کالج میں ماموں کے نام سے مشہور تھے (نہ معلوم انھیں کس وجہ سے یہ لقب دیا گیا) حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام رسول صاحب محکمہ مال میں گرداور تھے۔ ان کے دادا شیخ احمد صاحب چوک میں کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ یہ اُپل سے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی دکان پہنچنے تک فقیروں کو کوڑیاں تقسیم کرتے تھے۔ اس لیے کوڑی والے سوداگر کے نام

سے مشہور تھے۔ والدہ کے انتقال کے وقت ان کی عمر سات سال اور ان کے بھائی معین الدین کی عمر چار سال تھی۔ اس کے بعد ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ ان سے بھی اولادیں ہوئیں۔

احمد محی الدین کی ابتدائی تعلیم سلطان بازار مڈل اسکول میں ہوئی، مسٹر چندرواکر صدر مدرس تھے جو ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مڈل کا امتحان اس زمانے میں کافی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ امتحان انھوں نے درجہ اول میں کامیاب کیا، اس کے بعد چادر گھاٹ ہائی اسکول میں شریک ہوئے۔ اساتذہ ان کی ذہانت سے متاثر ہو کر ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس زمانے میں مسٹر مارماڈیوک پکتھال پرنسپل تھے۔ انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا اور پوری ریاست میں اول آئے۔ اس طرح گو کھلے اسکالر کہلائے۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے (اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی اور جامعہ عارضی طور پر توپ کے سانچہ اور چیاپل روڈ پر کرائے کے مکانوں میں تدریسی کام انجام دیتی تھی)۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی انھوں نے درجہ اول میں کامیاب کیا اور پوری جامعہ میں اول رہے۔ جب یہ انٹرمیڈیٹ میں زیر تعلیم تھے تو ان کے والد نے معاشی حالات سدھارنے کے لیے ان کو سرکاری ملازمت میں داخل کرنا چاہا اور محکمہ جنگلات میں ان کو ناظم جنگلات کے سامنے پیش کیا۔ ناظم صاحب نے اہلکاری کے احکامات ان کے حوالے کیے۔ نہ معلوم اس زمانے میں کون ناظم تھے۔ ابھی دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے ان کو واپس طلب کیا گیا اور مزید دریافت کیا گیا کہ کون سی جماعت میں اور کن مضامین میں تعلیم پا رہے ہیں۔ جب انھوں نے انکشاف کیا تو احکامات واپس لے کر ہدایت دی کہ اپنی تعلیم جاری رکھیں تا کہ مستقبل درخشاں ہو۔ پھر وہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے ہم جماعتوں میں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ بھی تھے، جنھوں نے 1940ء سے لے کر 1970ء تک اپنی خانگی پریکٹس میں شہرت حاصل کی۔ حنیف احمد انصاری مرحوم نے دوسری جنگ عظیم میں فوج میں، ڈاکٹر میر موثق الدین مرحوم سابق مہتمم سینٹ جارجس اسپتال بمبئی، ڈاکٹر محمود علی سابق پرنسپل عثمانیہ میڈیکل کالج، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جن کا مکان نارائن گوڑہ میں تھا سب ان کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

ایم بی بی ایس کا امتحان انھوں نے بدرجہ اول کامیاب کیا جو ایک مثال ہے۔ آخری امتحان کامیاب کرنے کے بعد ایک سال ہاؤس جاب لازمی طور پر کرنا پڑا کیوں کہ بدرجہ اول اور سب سے اعلی نمبرات لے کر کامیاب ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی تعنیاتی ڈاکٹر خورشید حسن صاحب فرسٹ سرجن کے یہاں ہوئی۔ ابھی دو ماہ کام نہ کر پائے تھے کہ ان کی کمر میں شدت کا درد شروع ہوا۔ ایکسرے کرنے پر پتہ چلا کہ ان کو ریڑھ کی ہڈی کے منکوں پر دق کے اثرات ہیں۔

اسکالرشپ سے استفادہ کرنے کا پانچ سالہ معاہدہ تھا۔ انھوں نے ملیشیا پہنچ کر پوری رقم اقساط سے حکومت کو واپس کر دی۔ یہ واحد شخص تھے جنھوں نے ایمانداری سے حکومت کو وظیفہ تعلیمی کی رقم واپس کر کے گلوخلاصی حاصل کی۔ ورنہ پانچ دس لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے رقم واپس نہیں کی۔ ان کے ضمانت داروں پر اس رقم کا مطالبہ کیا گیا۔ بعد میں شاید حکومت نے رعایت سے ضمانت داروں کو معاف کر دیا۔

ملیشیا میں تین سال معاہدہ پورا کر کے پروفیسر رضی الدین کی دعوت پر پاکستان گئے اور وہاں حیدرآباد سندھ میں لیاقت میڈیکل کالج کی بنیاد ڈالی اور پروفیسر آف اناٹومی بھی رہے۔ رضی الدین صاحب نے ان کو پشاور یونیورسٹی میں جہاں کے وہ وائس چانسلر تھے، میڈیکل کالج پشاور میں پرنسپل کے عہدہ کا پیشکش کیا لیکن انھوں نے صرف اناٹومی کی پروفیسر شپ قبول کی اور 1956ء تک وہاں رہے۔ جب وہاں بھی حالات ناسازگار ہوئے تو وہ بغداد یونیورسٹی میڈیکل کالج میں اناٹومی کے پروفیسر 1956ء سے 1959ء تک رہے۔ ڈاکٹر خواجہ نصیر الدین مرحوم بھی اسی زمانے میں سینئر ریڈیالوجسٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر سید عبد المنان بھی اس زمانے میں یعنی 1958ء میں جب بغداد کا سفر کیا تو ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جب تک یہ بغداد میں رہے روزانہ شام .Y.M.C.A میں جہاں وہ رہتے تھے ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ سنگاپور یونیورسٹی اور آسٹریلیا میں مانش یونیورسٹی میں پروفیسر اناٹومی رہے۔ ان جامعات پر تقررات عام طور پر دو سال کے معاہدہ پر ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دارالسلام Tanzania Lagon اور ملائشیا یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر اناٹومی کے خدمات

انجام دیں۔ پھر ریاض کے میڈیکل کالج میں دو مرتبہ ایک سال کے وقفہ سے کام انجام دے کر 1986ء میں سبکدوش ہو گئے۔

پروفیسر احمد محی الدین کو اردو اور انگریزی ادب پر بھی عبور تھا۔ ان کا مجموعہ کلام 'روئدادِ حال' شائع ہوا۔ ان کی دوسری اہم کتاب 'خود گزشت' ان کی سوانح عمری ہے جس میں انھوں نے جن جن ممالک میں کام کیا وہاں کے معاشرہ، اقتصادی اور تعلیمی حالات اور وہاں کے لوگوں کی بود باش کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔ اس زمانے میں مرض دق کے موثر علاج کے لیے جن ادویہ کی ضرورت تھی وہ دستیاب نہیں تھیں۔ دق کسی عضو بدن کا ہو سوائے اچھی غذا، آرام کے کوئی اور علاج نہ تھا۔ ان کے لیے یہ دوا تجویز ہوئی کہ یہ اوندھے لیٹے رہیں۔ ان کے صبر واستقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس طرح نو مہینے کاٹ دیے اور اللہ تعالی کے فضل و کرم سے مکمل صحت یاب ہو گئے۔

صحت یاب ہونے کے بعد ان کا تقرر میڈیکل کالج شعبہ میڈیسن میں کلینکل لکچرر کے طور پر ہوا جہاں انھوں نے محنت سے طالب علموں کو پڑھایا۔ جنگ عظیم شدت سے جاری تھی تو انھوں نے قلیل مدتی کمیشن کے لیے درخواست دی اور IMC میں بطور کیپٹن ان کا تقرر ہوا۔ انھوں نے مشرق وسطی عراق میں دو سال خدمات انجام دیں اور جنگ کے اختتام پر سبکدوش ہو کر حیدر آباد لوٹے۔ اس زمانے میں مابعد جنگ منصوبہ بندی کے تحت حیدر آباد مختلف شعبوں سے تعلیم یافتہ نو جوانوں کا انتخاب کر کے سرکاری وظیفہ دے کر ڈیپوٹیشن پر زیادہ تر انگلستان یا امریکہ بھجواتی تھی۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت ان کا انتخاب اناٹومی (شعبہ طب) میں پی ایچ ڈی کے لیے ہوا اور ان کو لندن جانے کے لیے اسکالرشپ عطا کیا گیا۔ وہ 1946ء کے آواخر میں انگلستان روانہ ہوئے۔ وہاں لندن کے مشہور دواخانے اور میڈیکل کالج Saint Thomas Hospital میں اناٹومی میں تحقیق اور پی ایچ ڈی کرنے کا موقع ملا۔ سنہ 1950ء کے ماہ ستمبر میں ڈاکٹر عبدالباری مرحوم، ڈاکٹر احمد محی الدین اور ڈاکٹر منان ختم تعلیم کے بعد ایک ہی ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچے تو حیدر آباد کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

ڈاکٹر منان اور ڈاکٹر عبدالباری تو سنٹرل ملٹری ہاسپٹل میں اپنی خدمات پر رجوع ہوئے۔

اس وقت دواخانہ خالی ہو چکا تھا۔ احمد محی الدین نے بھی میڈیکل کالج میں واپسی کی اطلاع دی تو پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود پروفیسر کی جائیداد پر ان کا تقرر نہ ہوا۔ لیکن ان کو اسسٹنٹ پروفیسر کی عہدہ پیش کیا گیا۔ آخر انھوں نے اس خدمت کو قبول کرلیا۔ ایک سال کام کرنے کے بعد ان کو ملائشیا کے میڈیکل کالج میں پروفیسر کی خدمت کا پیشکش ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کر کے رخت سفر باندھا۔

ان کی کتاب Handbook of Anatomy ریاض یونیورسٹی کی طرف سے شائع کی گئی۔ ان کی بین الاقوامی شہرت یافتہ تصنیف جو انھوں نے Prof Hayin کے انسانی جینیات Human Embryology پر لکھی وہ کافی مقبول ہوئی۔ اس کا جرمن اور جاپانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کو باغبانی کا بھی شوق ہے۔ انھوں نے جہاں حالات سازگار رہے اپنے صحن میں پھلوں کے درخت لگائے۔ کنڈوں میں ترکاری اگائی۔ اگر ان کو ماہر تغذیہ بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ خود بہترین کھانا بھی بناتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد محی الدین نے تیس سال تک قرآن شریف کے مختلف تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ مارماڈیوک پکتھال محمد اسد کا انگریزی ترجمہ جو مستند سمجھا جاتا ہے، عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ اور اردو کے بیشتر مفسرین کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک تصنیف اردو اور انگریزی میں شائع کی جو Islam and Society (اسلام اور سوسائٹی) کے نام سے حیدرآباد میں شائع ہوئی۔

ایک سائنسی (میڈیکل سائنس) کیا ناٹومی کے ماہر کی ہمہ جہتی غیر معمولی قابلیت، عقبریت کی دلیل ہے۔ خرابی صحت اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے وہ آج کل اپنی لڑکی کے یہاں لیورپول میں مقیم ہیں۔

☆ ☆ ☆

کتاب: ڈاکٹر سید عبدالمنان جامع الصفات شخصیت

مرتبہ عائشہ فاطمہ، ایم اے، ایم فل

سنہ اشاعت 2003ء؛ ص 107 سے 112۔

دلؔ، بدرؔ اور لمعہؔ

حیدرآباد، اردو زبان، جدید طب اور میڈیکل ڈاکٹر کے موضوعات پر مواد کی تلاش کے دوران میں نے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب 'مرقع سخن' اور نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' کی ورق گردانی بھی کی۔ ان کتابوں میں مجھے تین یا چار ڈاکٹر شاعروں کے بارے میں پڑھنے کا موقع ملا۔ نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' میں تین ڈاکٹر شاعروں کا نہایت مختصر تعارف کے ساتھ نمونۂ کلام بھی پیش کیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

محمد حیدر دلؔ

محمد حیدر نام اور دلؔ تخلص، افلاطون جنگ لقمان الدولہ اشرف الحکما خطاب تھا۔ ۱۲۷۷ھ (1860ء) میں تولد ہوئے اور ۱۳۴۰ھ (1921ء) میں وفات پائی۔ حیدرآباد ہی میں ڈاکٹری کی تعلیم پائی، ۱۲۹۹ھ (1881ء) میں اس کا امتحان پاس کیا۔ اولاً شمس الامراء کے یہاں ملازم ہوئے۔ پھر خانگی طور پر علاج کرتے رہے، اس کے بعد حضرت غفران مکان کے اسٹاف سرجن مقرر ہوئے، بیش قرار تنخواہ، خطاب اور اعزازات سے ممتاز ہوئے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ حفیظ الدین پاسؔ سے تلمّذ حاصل کیا تھا۔ تصوف کا خاص شوق تھا۔ اسی شوق نے شاعری کی طرف مائل کیا۔ سوانح جامیؔ، نماز دل وغیرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ (ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے سنہ 1881ء سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلؔ نے حیدرآباد میڈیکل اسکول سے

حکیم کی ڈگری حاصل کی تھی)۔

دل کا آنا، جی کا جانا ہوگیا
آنکھ لڑ جانا بہانہ ہوگیا

تذکرے ہوتے ہیں اب تو جابجا
یار کا میرا افسانہ ہوگیا

پھنس گیا زلفوں میں دل اچھا ہوا
بے ٹھکانے کا ٹھکانا ہوگیا

کوئے قاتل میں چلو، جو ہو سو ہو
جان اک دن جانے والی جائے گی

ڈاکٹر ابوالکلام بدرالدین بدرؔ

ابوالکلام بدرالدین نام اور بدرؔ تخلص، جامعہ عثمانیہ کے اوّلین دور کے گریجویٹ ہیں۔ پھر ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹری کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ شاعری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ غزل گوئی اور نظم نگاری میں بڑی عمدہ دستگاہ حاصل ہے۔ حسن و عشق اور رومان کے رنگین مزاج رنگین خیال شاعر ہیں۔ سلاست اور روانی ان کے نغموں کی جان ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام بدرؔ نے رامائن کے کئی کانڈ (باب) کو نہایت سلیس اردو میں نظم کیا ہے۔ بدرؔ کا انتقال ہو چکا ہے۔

جراثیم میں بھی طرح داریاں ہیں
قضا میں قضا کی یہ چنگاریاں ہیں

یہ افشاں سے ہیں کاکلِ عنبریں کے
شریچہ پہ تارے ہیں چرخ بریں کے

انہیں پالنا نازبرداریوں سے
بڑی کاوش اور بیداریوں سے

بہت تجربوں سے یہ پائے ہوئے ہیں
یہ تحقیق کے گل کھلائے ہوئے ہیں

یہ لڑیاں ہیں ان کی کہ موتی کے دانے
انہیں شکل پیاری عطا کی خدا نے

یہ افعی ہیں یا موت کے نامہ بر ہیں
ستم کوش فطرت کے تیرِ نظر ہیں

رگ وریشہ گویا ولایت ہے ان کی
قضا کا ہراول سرایت ہے ان کی

کھلے بندوں کی کوئی، کوئی گھات میں ہے
سکندر کوئی بحرِ ظلمات میں ہے

وہ جیتا بچے کب جو بسمل ہے اک کا
لعاب دہن زہرِ قاتل ہے ان کا

ہر اک فرد ان میں کا رنگین ادا ہے
اگرچہ ہے ظالم، بڑا دل ربا ہے

رگِ جاں کا دشمن یہی نازنیں ہے
جلالِ مشیّت بھی کتنا حسیں ہے

ڈاکٹر محمد عباس علی خان لمعہؔ

محمد عباس علی خان لمعہؔ تخلص، سٹی ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد ڈاکٹری تعلیم پائی۔ سرجری میں مہارت حاصل کی۔ شاعری سے بچپن سے دلچسپی رہی۔ اردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی شاعری کا بھی شوق رہا۔ لمعہ اقبالؔ سے بھی زیادہ متاثر ہیں۔ اقبالؔ سے ان کو بچپن ست عقیدت رہی۔ ڈاکٹر عباس علی لمعہ 6 مارچ 1977ء کو اس دنیا سے چل بسے۔ اب تک ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عرصہ پہلے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 'پریم رس' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

پیری میں شباب یاد آیا ۔۔۔ زاہد کو خضاب یاد آیا
دنیا نے بھلا دیا سب کو ۔۔۔ محشر میں حساب یاد آیا
جی بھر کے رولیا اسی وقت ۔۔۔ جب کان کا عتاب یاد آیا
رحمت کا خیال کرکے مجھے ۔۔۔ دوزخ کا عذاب یاد آیا
اللہ رے وسعتِ تخیل ۔۔۔ دریا کو حباب یاد آیا

☆ ☆ ☆

'دکن میں اردو'

نصیرالدین ہاشمی

ناشر: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی۔

صفحات: 598-597؛ 722-721؛ 728-727۔

دیگر ڈاکٹر

’جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور ڈاکٹرس‘ عنوان کے تحت میں نے ان ڈاکٹروں کے متعلق قدرے تفصیل سے سوانحی مضامین تحریر کیے ہیں جو عثمانین رہے ہیں اور جن سے میری آشنائی رہی ہے یا جن کے بارے میں مختلف ذرائع سے مجھے معلومات حاصل ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ان ڈاکٹروں نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں حسبِ مقدور حصّہ بھی لیا ہے۔ان ڈاکٹروں میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر آر طاہر قریشی، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، ڈاکٹر مجید خان، ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر شیام سندر پرساد، ڈاکٹر سکندر حسین، ڈاکٹر محمد یوسف احمد، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر سعید نواز، ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان، ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع اور خود میں (ڈاکٹر عابد معز) شامل ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے ان پندرہ اردو قلم کار ڈاکٹروں کے علاوہ مجھے جرائد میں دو ایک عثمانین ڈاکٹروں کے بارے میں مضامین ملے اور میں نے پروفیسر (ڈاکٹر) احمد محی الدین اور ڈاکٹر رنگا راؤ رنگین پر لکھے ہوئے مضامین کو بھی کتاب میں شامل کرلیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے بعض اردو ڈاکٹر قلم کار ایسے بھی ہیں جنھیں اردو زبان وادب سے دلچسپی تو رہی ہے لیکن پیشہ ورانہ مصروفیات کے سبب ادب میں کم سرگرم رہے ہیں جس کے سبب ان کے بارے میں ہمیں خاطر خواہ معلومات نہیں ہیں۔ اس باب میں ان ڈاکٹروں کے بارے میں جو

معلومات حاصل ہوسکیں وہ تحریر کیا جارہا ہے۔

ان کے علاوہ بھی جامعہ عثمانیہ کے ایسے اردو ڈاکٹر قلم کار ہوں گے جن سے میں ناواقف ہوں۔ میں اپنی کم مائیگی کا برملا اعتراف کرتا ہوں۔ میری قارئین سے درخواست ہے کہ آپ ہماری معلومات میں اضافہ کریں اور جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کاروں کو یکجا جمع کرنے میں مدد کریں تاکہ ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوسکے۔

ڈاکٹر سید اختر احمد

میرا مضمون 'جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پرور ڈاکٹرس' کی سہ ماہی رسالہ 'ہمارا پھولبن' میں اشاعت کے بعد جناب سید علی اکبر نے فون کرکے بتایا کہ شہر کے ایک قدیم محلّہ منڈی میر عالم میں ڈاکٹر سید اختر احمد مطب کیا کرتے تھے جن کی اردو میں کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ یہ نام سنا ہوا تھا اور میں نے احباب سے ان کے متعلق پوچھا بھی تھا لیکن تفصیلات حاصل نہ ہوسکی تھیں۔

ڈاکٹر سید اختر احمد کی کتابوں کو میں نے ریختہ پر تلاش کیا تو کامیابی ملی۔ اس ویب سائٹ پر ڈاکٹر سید اختر احمد کی چھ کتابیں موجود ہیں۔ دو مقالے بعنوان 'خالقِ کائنات' اور 'اسرارِ کائنات' سنہ 1960ء میں شائع ہوئے جو تیس سے چالیس صفحات پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر احمد کی ایک اور کتاب 'اشرف المخلوقات' سنہ 1963ء میں شائع ہوئی۔ آپ کی چوتھی تصنیف 'اسرار کائنات واشرف المخلوقات' تھی جو سنہ 1968ء میں شائع ہوئی جو 186 صفحات پر مشتمل ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین نے بتایا کہ ڈاکٹر سید اختر احمد شاعری بھی کرتے تھے اور ان کا ایک مجموعہ 'گلستانِ اختر' بھی شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ کلام بھی ریختہ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ڈاکٹر سید اختر احمد کا نہایت مختصر، صرف 31 صفحات پر مشتمل دوسرا مجموعہ کلام 'دل کی روشنی' بھی ریختہ پر ملا۔

ڈاکٹر سید اختر احمد کی کتابوں پر ان کے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس اور قوسین میں عثمانیہ لکھا ہوا ہے اور ابتدائی صفحات پر کتاب کے موضوع کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن کسی کتاب میں ڈاکٹر سید اختر احمد کی زندگی کے کوائف یا ان کی زندگی کے متعلق مضمون نہیں ملا۔

کتاب 'اشرف المخلوقات' کے ابتدائی صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ابتدا ہی سے ادب، دین اور فلسفہ میں دلچسپی رکھتے تھے اور ڈاکٹر بننے کے بعد بھی مطب کی مصروفیت کے باوجود ان موضوعات پر خاصا کام کیا تھا۔ محترم نجم آفندی نے کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ 'انسان اشرف المخلوقات کے خطاب کا مستحق کب اور کس طرح ہوتا ہے اس پر ڈاکٹر صاحب نے ایسی روشنی ڈالی ہے اور اس موضوع کے ہر ہر جزو پر ایسی مکمل بحث کی ہے، وہ اپنا جواب آپ ہے۔'

کتاب میں ڈاکٹر سید اختر احمد نے بڑی کارآمد باتیں بھی بتائی ہیں۔ مثال کے لیے غذا کے متعلق ان کا یہ جملہ نقل کیا جاتا ہے کہ 'انسان کی پہلی ضرورت مناسب غذا ہے جس کے بغیر نہ زندگی قائم رہ سکتی ہے اور نہ صحت!'

ڈاکٹر محمد سالک

انٹرنیشنل انڈین اسکول ریاض کے سابق پرنسپل ڈاکٹر افسر خان شہاب جو افسانہ نگار بھی ہیں، کی کتاب کی رسم اجرا کی دعوت پر اورنگ آباد شہر جانا ہوا۔ آصف جاہی حکمرانوں کا ابتدا میں پایۂ تخت اورنگ آباد ہی رہا ہے۔ سابق ریاستِ حیدرآباد میں اورنگ آباد کے لوگ ایم بی بی ایس کی تعلیم کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج، جامعہ عثمانیہ ہی آتے تھے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے عثمانین ڈاکٹروں کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے ماہر امراض چشم ڈاکٹر محمد سالک کے بارے میں بتایا گیا۔

ڈاکٹر محمد سالک کے تحریر کردہ صحت وطب سے متعلق مضامین کا ایک مجموعہ 'ڈاکٹر بصورت مسیحا' شائع ہوا ہے۔ ایک سو اسی صفحات اور ستائیس مضامین کے اس مجموعہ کو ڈاکٹر محمد سالک کی دختر ڈاکٹر مسرت فردوس نے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ ڈاکٹر رفیق ذکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد میں اردو کی لیکچرر رہ چکی ہیں۔

کتاب کے بیک کور پر ڈاکٹر محمد سالک کے بارے میں نہایت مختصر معلومات دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پیدائش 19 مئی 1925ء بتائی گئی ہے اور آپ کے والد کا نام شیخ محبوب تھا۔ ڈاکٹر محمد سالک نے جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس اور ناگپور سے امراض چشم کی پوسٹ گریجویٹ

ڈگریاں ڈی او (DO) اور ایم ایس (MS) حاصل کیں تھیں اور سرکاری ملازمت سے سیول سرجن کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے۔

'حرف آغاز' کے عنوان سے ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ لکھتی ہیں کہ 'میرے والد مرحوم ڈاکٹر محمد سالک، سابق سیول سرجن و ماہر امراض چشم کے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ مضامین عام بیماریوں سے متعلق ہیں۔ بیماری کی معلومات، بچاؤ کی تدابیر اور علاج سے متعلق اہم کارآمد اور مختصر معلومات عام فہم زبان میں ہے۔ ہر شخص کو اگر بیماریوں کی بنیادی معلومات ہو تو وہ بہت سی پریشانیوں اور اخراجات سے بچ سکتا ہے۔'

آگے وہ لکھتی ہیں کہ 'ابّو کو اردو زبان سے ایک خاص شغف تھا۔ مادری زبان سے تو ہر شخص محبت کرتا ہے لیکن ابّو کی ابتدائی تعلیم بھی اردو میں ہوئی اور M.B;B.S. کی تعلیم بھی جامعہ عثمانیہ اردو ذریعہ تعلیم سے مکمل کی اور سند بھی اردو میں ملی۔ ابّو کو اردو لٹریچر سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ جب بھی وقت ملتا ادبی رسالے ان کے زیر مطالعہ رہتے۔ ان کو پڑھ کر لطف بھی اٹھاتے اور بحث و مباحثہ بھی کرتے تھے۔'

ڈاکٹر سید عبدالجلیل

اورنگ آباد شہر کے نامور ادیب اور استاد جناب احمد اقبال سے ملاقات ہونے پر انھوں نے اپنی کتاب 'میرا شہر میرے لوگ (جلد سوم)' عنایت کی۔ سرسری ورق گردانی کے دوران میری نظر ڈاکٹر سید عبدالجلیل، ایم بی بی ایس، ڈی سی ایچ پر لکھے گئے مضمون پر ٹک گئی۔ احمد اقبال صاحب نے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کے تعارف میں لکھا ہے کہ 'ڈاکٹر جلیل کا آبائی وطن آلیر، ضلع بھونگیر ہے۔ ان کی زیادہ تر تعلیم بلدہ حیدرآباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے فارغ، حیدرآبادی تہذیب کے پروردہ ڈاکٹر جلیل جب اورنگ آباد میں آئے تو ان کی عمر لگ بھگ تیس برس رہی ہوگی۔'

مضمون میں احمد اقبال صاحب نے آگے لکھا ہے کہ 'یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر جلیل نے صحت عامہ سے متعلق رہبری کے لیے دو کتابچے 'رہنمائے صحت' حصّہ اول و حصّہ دوم شائع کروائے تھے۔ اس زمانے میں امراض کے علاج اور ان کی روک تھام کے سلسلے میں اردو میں کوئی

کتاب نہیں تھی۔ان کتابچوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ یہ اپنے آپ میں پہلی اور انوکھی کوشش تھی۔'

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی (موصوف اورنگ آباد کے مولانا آزاد کالج میں بھی اردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں)، سے ڈاکٹر سید عبدالجلیل کی کتابچوں کا ذکر کرنے پر انھوں نے ایک کتابچہ مجھے دیا۔ یہ کتابچہ سنہ 1972ء میں شائع ہوا تھا اور وہ اسّی صفحات پر مشتمل ہے۔

کتابچہ میں متعدی امراض پر نسبتاً مختصر مضامین اہم اور ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالجلیل صاحب عوام الناس کو صحت وطب کے حوالے سے جانکاری فراہم کرنا اپنی ذمّہ داری سمجھتے تھے، 'حرف آغاز' میں وہ رقم طراز ہیں۔'میں سوچنے لگا کہ صرف بیماریوں کا تندہی سے علاج کرنا ہی میرا فریضہ نہیں ہے۔دق اور دق کی طرح دوسری موذی بیماریوں سے عوام کو محفوظ رکھنا بھی میری فنی، سماجی اور ملکی ذمّہ داریوں میں داخل ہے۔'

ڈاکٹر مصطفی علی زیدی

ایک ملاقات میں علامہ اعجاز فرخ نے ڈاکٹر مصطفیٰ زیدی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ عثمانین تھے اور پرانے شہر میں مطب کیا کرتے تھے۔ان کی تین کتابیں 'خلق اعظم، خلق معظم اور پیام امن' شائع ہوچکی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر مصطفیٰ زیدی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر محمد عبدالمعید

ڈاکٹر محمد عبدالمعید، افسر آرموری کے قلمی نام سے دکنی لہجے میں مزاحیہ نثر لکھتے ہیں۔لکھنا بہت دیر سے چند سال پہلے شروع کیا لیکن پابندی سے ماہنامہ شگوفہ میں آپ کے مزاحیہ مضامین 'دکنیات' کے زیرِعنوان شائع ہوئے ہیں۔ڈاکٹر عبدالمعید 1945ء کو آرمور میں پیدا ہوئے۔عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور ایم ڈی کیا۔ ماہر امراض اطفال کی حیثیت سے حیدرآباد میں کچھ عرصہ پریکٹس کی اور پھر سعودی عرب روانہ ہوئے جہاں وہ رائل کلینک سے 33 سال وابستہ رہنے کے بعد وطن واپس ہوئے۔

ڈاکٹر مرزا کلیم اللہ بیگ

ڈاکٹر مرزا کلیم اللہ بیگ، عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل میڈیکل اسپیشلسٹ ہیں جنھوں نے سعودی عرب میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔آپ کے مزاحیہ مضامین اور انشائیے ماہنامہ شگوفہ میں پڑھنے کو ملتے رہے ہیں۔شاید مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔میں نے شہر میں آپ کا پتہ اور فون نمبر معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ان سے رابطہ ہوسکا اور نہ ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوسکیں۔

ڈاکٹر رام پرشاد

ڈاکٹر رام پرشاد کا تعلق کائستھ برادری سے تھا اور شہر کے اردو آبادی والے گنجان علاقہ میں ملے پلی میں پریکٹس کرتے اور دواخانہ چلاتے تھے۔اردو زبان پڑھی تھی اور اس کے عاشق بھی تھے۔ اردو کی محفلوں بالخصوص زندہ دلان حیدرآباد کے اجلاسوں میں شریک ہوتے اور سب کی توجہ کا مرکز ہوا کرتے تھے۔زندہ دلان کی 'محفلِ لطیفہ گوئی' میں انھوں نے لطیفے بھی سنائے ہیں۔

ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے ڈاکٹر رام پرشاد کے خاکے میں لکھتے ہیں۔'ڈاکٹر رام پرشاد اردو ادیبوں کا مفت علاج کرتے ہیں بلکہ ادیب اگر اچھا ہو تو اسے کھانا بھی کھلاتے ہیں۔یہی نہیں ادیب اگر مزاح نگار ہو تو اس کا بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ علاج کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ جو فن کار لوگوں میں ہنسی کی دولت بانٹتا ہے،اس کا رتبہ بھی ڈاکٹر کے برابر ہوتا ہے کیوں کہ ایک اچھے سماج کی صحت کا انحصار اس کی حسِ مزاح پر ہوتا ہے۔'

ڈاکٹر خالد عبدالسمیع

جب میں ریاض، سعودی عرب پہنچا تو میری ملاقات اپنے ایک سینئر عثمانین ڈاکٹر خالد عبدالسمیع سے ہوئی جو کنگ فیصل اسپیشلسٹ ہاسپٹل میں ماہر تخدیر یعنی انستھشیا لوجسٹ کے طور پر فائز تھے۔اب وہ امریکہ میں ہیں۔ایم بی بی ایس سے پہلے کی ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی تھی اردو زبان پر عبور خوب تھا۔ڈاکٹر سمیع نے گنے چنے چند مضامین ہماری فرمائش پر تحریر کیے تھے۔اگر وہ اس جانب توجہ کرتے تو اردو زبان و ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر سکتے تھے لیکن مصروفیت نے اجازت نہیں

دی۔شہر ریاض کی اردو محافل میں وہ شریک رہتے تھے۔

ڈاکٹر میر محمد علی

ڈاکٹر سید عبدالمنان کے ہم جماعت تھے اور قلب شہر کی تاریخی عمارت 'البیوت الاقامت المجردین '(عمارت کی سنگ بنیاد پر تحریر کردہ نام) عرف عام میں مجرد گاہ یعنی بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ میں مطب تھا۔مطب کے بورڈ پر اردو میں ڈاکٹر صاحب کا نام جلی حرفوں میں لکھا ہوتا تھا جو وہاں سے گزرنے والوں کی توجہ مبذول کرواتا تھا۔

ڈاکٹر میر محمد علی صبح کے وقت میں چار مینار کے شرق میں بھی مطب کیا کرتے تھے اور میں اکثر آپ کے مطب جایا کرتا تھا۔ڈاکٹر میر محمد علی کے مطب میں اردو میں طبع زاد ہدایات اور جسمانی درجہ حرارت درج کرنے کا چارٹ دیا جاتا تھا۔

قارئین سے التماس

جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کاروں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی و ترویج میں حصّہ لیا اور ادب بھی تخلیق کیا ہے، کی فہرست اور ان کا ذکر یہیں ختم نہیں ہوتا۔اس سلسلے کے چند دوسرے نام بھی ہوں گے۔جب میں کالج (ستر کے دہے) میں تھا اس وقت کالج میگزین میں 'حصّہ اردو' بھی ہوتا تھا جس میں شعری و نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔سینئر ڈاکٹروں سے سنا ہے کہ کالج ڈے تقریبات میں مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا۔یہ اور دوسرے شواہد اس بات کے غماز ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے اور بھی اردو ڈاکٹر قلم کار ہوں گے جو چھوٹ گئے ہیں۔لہذا قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس منفرد کام کو آگے بڑھانے میں مدد کریں۔۔۔شکریہ۔

ڈاکٹر عابد معز کی کتابیں اوران سے متعلق تصانیف بیک نظر

صحت، طب اور تغذیہ - کتابیں اور کتابچے

☆ذیابیطس کے ساتھ ساتھ	☆چکنائی اور ہماری صحت	☆فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس
☆رمضان اور ہماری صحت	☆حج وعمرہ اور ہماری صحت	☆ہماری غذا میں حیاتین اور معدنیات
☆کولیسٹرال کم کیجیے	☆تول ناپ کر صحت مند رہیے	☆توضیحی فرہنگ، غذا اور تغذیہ
☆عام طبّی معائنے	☆بلڈ پریشر نارمل رکھیے	☆ترکاری اور پھل زیادہ کھائیں
☆ نمک کا استعمال کم کریں	☆موٹاپا ہماری صحت کا دشمن	☆ پکوان کا تیل، انتخاب اور مقدار
☆ذیابیطس کو شکست دیجیے	☆شکر کم کھائیں	☆ پانی صحت اور زندگی کی ضرورت
☆صحت کی دیکھ بھال	☆بخار مرض نہیں ایک علامت	☆کھانے میں ہماری صحت ہے
☆بہت سے مختلف ڈاکٹر	☆اردو میں سائنسی وسائل	☆Ramadan & Our Health

اردو زبان وادب اور طنزومزاح - کتابیں

☐ واہ حیدرآباد	☐ بات سے بات	☐ ہنسی، طنزومزاح اور ڈاکٹر
☐ عرض کیا ہے	☐ پھر چھڑی بات	☐ حیدرآباد میں اردو کے ذریعہ جدید طب
☐ یہ نہ تھی ہماری قسمت	☐ اتنی سی بات	☐ جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان وادب پر ورڈاکٹر
☐ فارغ البال	☐ وہاں کی بات	☐ دھوم ہماری زباں کی
☐ اردو ہے جس کا نام	☐ آئی گئی بات	☐ شاعری ذریعہ عزت نہیں
☐ دھنک رنگ	☐ بات کا بتنگڑ	

عابد معز کے فکروفن پر کتاب، گوشہ اور نمبر

● ماہنامہ **شگوفہ**، عابد معز نمبر، نومبر 2008ء ● ماہنامہ **شاعر**، گوشہ عابد معز، 2017ء

● کتاب: عابد معز کی ادبی شناخت مرتب رفیق جعفر ● **اندازِ بیان 3** میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات

ملنے کے پتے

ہدی بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد۔ موبائل 9246271637 **مرزا ورلڈ بک ہاؤس**، اورنگ آباد۔ 9325203227

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 93-6058-305-7

9 789360 583057